ماہنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

APRIL 1986

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

حیات نو

اپریل سنہ ۱۹۸۶ء

مدیر مسئول: ابوالکلام فلاحی

مدیر: طارق فارق طیب فلاحی

قیمت فی شمارہ: ۲ روپے ۵۰ پیسے

سالانہ تعاون: ۲۵ روپے

ترسیل زر کا پتہ

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ (یوپی) ۲۷۶۱۲۱

نقوش حیات نو

		صفحہ
اداریہ		
وہ عورتوں کے محافظ کب تھے؟	ایڈیٹر	۳
انٹرویو مدیر "تکبیر" پاکستان" سے ایک انٹرویو	ابوسفیان اصلاحی	۸
مقالات		
قرآن اور اس کی سحر انگیزی	سمیع اختر فلاحی	۲۰
جندیشاپور کا قدیم مدرسہ اور طب کی ترقی میں اس کا حصہ	عبدالباری فلاحی علیگ	۲۵
تصویر وطن		
مسلم خواتین بل ۱۹۸۶ء	ادارہ	۳۰
یوپی کی قدیم مساجد کو مندر بنانے کی سازش	ادارہ	۳۵
سخن در سخن		
پروفیسر عبدالمغنی کے خط پر تبصرہ	ماسٹر عبدالجلیل شبلی کالج اعظم گڑھ	۳۸
شعر و نغمہ		
غزل	حفیظ میرٹھی	۳۹
غزل	ابوالمجاہد زاہد	۴۳
غزل	ابوالمجاہد زاہد	۴۳
غزل	اسلم نصیرپوری	۴۳
غزل	ابوالمجاہد زاہد	۴۴
تعارف و تبصرہ		
وہ کتاب جس پر تبصرہ میں تاخیر ہوگئی	ڈاکٹر صلاح الدین عمری علی گڑھ	۵۱
حلقۂ یاراں	عبیداللہ فہد، محمد صمدی	۵۰
جامعہ کے لیل و نہار	آل نم	۵۵

اداریہ

وہ عورتوں کے محافظ کب تھے؟

۱۲ فروری ۱۹۸۶ء کو اعظم گڑھ بس اسٹینڈ پر ہماری بس لکھنؤ جانے کے لئے تیار کھڑی تھی، شب کے ۸ بجنے والے تھے ڈرائیور کے قریب آمنے سامنے دو سیٹوں پر ہمارے تین نوجوان ساتھی بیٹھے ہوئے تھے جو میرے ساتھ SIO کے سہ روزہ تربیتی کیمپ میں شرکت کے لئے لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے میرے دائیں اور بائیں دو غیر مسلم دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پیچھے تمام بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی، زیادہ تر مخالف عقیدے کے افراد سوار تھے۔ کچھ مسافروں نے جو میرے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے مجھے سنانے کے انداز میں اس طرح آپس میں گفتگو کا آغاز کیا "محمد احمد کتنا ظالم شخص ہے اپنی ۶۰ سالہ بیوی کو طلاق دے کر در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دیا۔" دوسرے نے کہا جب وہ جوان تھی تو جوانی کے مزے لوٹتا رہا اور جب وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تو اسے گھر سے نکال دیا ظلم کی انتہا کر دی" ایک نے کہا، سپریم کورٹ کے فیصلے کی بھی سب مخالفت کر رہے ہیں، عورتوں کو ان کا حق نہیں دینا چاہتے، ان کو گھر کی چہار دیواری میں قید رکھنا چاہتے ہیں" گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی اور شرکا کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے ایک ساتھی کو یہ بات پسند نہ آئی، اس نے میری طرف ایک عجیب نظر سے دیکھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ اگر آپ نے اس کو ختم نہیں کیا تو یہ لکھنؤ تک چھیڑتے رہیں گے۔ تب میں نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی، میں نے اپنے پہلو کے نامعلوم غیر مسلم دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بھائی صاحب کل آج (ہندی ڈیلی اخبار) میں صفحۂ اول پر تین خبریں شائع ہوئی تھیں شاید آپ کی نظر ان پر پڑی ہو؟ انھوں نے تجسس سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ وہ خبریں کیا تھیں، میں نے کہا، تین دلہنوں کو تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی اور ان تینوں نے دم توڑ دیا تھا، قصور ان کا یہ تھا کہ وہ شادی میں جہیز نہ لا سکی تھیں اور ان کی شادی کو ابھی زیادہ دن بھی نہ گزرے تھے۔ میری بات ابھی ختم نہ ہوئی کہ پیچھے

سے ایک آواز آئی "ایسے لوگوں کو سڑک پر کھڑا کرکے گولی مار دینا چاہئے" میں نے کہا، اخباری رپورٹوں کے مطابق دلی شہر میں ایک مہینہ میں ۹۰ عورتیں جلائی جاتی ہیں یعنی روزانہ تین، اور اگر پورے ہندوستان کے اخبارات کو اکٹھا کیا جائے تو صرف جہیز میں روزانہ جلنے والی عورتوں کی تعداد ۵۰ سے کم نہ ہوگی پھر کسی صاحب نے کہا، مسلمان عورتیں بھی جلائی جاتی ہیں، میں نے کہا ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے، سماج بہت بگڑ گیا ہے، اس کو سدھارنے کے لئے آپ کے پاس کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ اور جواب میں طویل خاموشی چھا گئی .... گھنٹوں کی مسافت جیسی طویل ....

یہ واقعہ ہے جو میرے ساتھ پیش آیا۔ اس طرح کے واقعات ہزاروں کی تعداد میں پورے ہندوستان میں روزانہ پیش آرہے ہیں بلکہ کچی بات تو یہ ہے کہ اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، جماعتیں انجمنیں، پارٹیاں تمام کے تمام اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ گئے ہیں گویا پورا ہندوستان ایک بزم مشاعرہ ہے۔ جس کا مصرع طرح اسلام اور مسلم مطلقہ عورت ہے اور گدھے گھوڑے، کتے، بلی، لومڑی، سیار، بھیڑیے، الو، اور گدھ اس مشاعرہ کے معزز مہمان ہیں اور اپنی اپنی آوازیں گرہ لگائے جا رہے ہیں۔

---

۲۵ فروری ۱۹۸۶ء کو لوک سبھا میں جب راجیو گاندھی نے مسلم مطلقہ عورت کے حقوق کی حفاظت کا بل پیش کیا تو وہ خباثت نفس جو اندر چھپی ہوئی تھی اور جس پر عیاری اور مکاری کا پردہ پڑا ہوا تھا ایک دم سامنے آگئی۔ کمیونسٹ پارٹی، سوشلسٹ پارٹی، بی جے پی، جنتا پارٹی، تلگو دیشم تمام اپوزیشن پارٹیاں عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے نام میں ننگی ہو گئیں اور اس بل کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئیں، تقریر، تحریر، و بیانات کا ایک سیلاب آگیا جس سے تمام اخبارات و رسائل بھر گئے اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اگر یہ بل منظور ہو گیا تو ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

اپوزیشن اور بھارت کی غیر مسلم تنظیموں اور جماعتوں کی اس اسلام دشمنی اور مطلقہ عورت کے حقوق کی حفاظت کے بل کی مخالفت کی روش پر دوسروں کو حیرت ہوئی ہو تو ہوئی ہو لیکن مجھے ذرہ برابر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ یہ عورتوں کے حقوق کی محافظ ہی کب تھیں، یہ تو پیچھ

مفاد کے لئے ان کے دور میں ترقی ہیں اور اپنے ہی مفاد میں ان کی مخالفت کرتی ہیں۔ ان کو عورتوں سے ہمدردی نہ پہلے تھی، نہ آج ہے، اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ عورتیں لطف ولذت اور عشق ومحبت کے لئے بنائی گئی ہیں اس لئے اس کا موقع ان کو ملنا چاہئے کلیوں کے کھلنے چٹکنے اور پھول بننے کے بعد بھونروں کو طواف کی اجازت ہونی چاہئے کلی کی آزادی یہ ہے کہ وہ انگڑائیاں لے، اٹھلائے اور بھونروں کو لطف اندوز ہونے کی اجازت دے۔ اور بھونرے کی آزادی یہ ہے کہ وہ جس کلی پر چاہے منڈلائے، بیٹھے، اور اس کا رس چوسے اور اس کا موقع پردے کے اندر، گھر کی چہار دیواری کے اندر نہیں مل سکتا، اس لئے انھوں نے کہا عورت جانوروں کی طرح قید کرنے کے لئے نہیں ہے اس کو آزادی ملنی چاہئے۔

آج عورت کہیں بھی محفوظ نہیں ہے، اس کو ہر جگہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور موقع ملتے ہی اس کے ردائے عصمت کو تار تار کر دیا جاتا ہے۔ بسوں، ٹرینوں، دفتروں یہاں تک کہ تعلیم گاہوں میں بھی عورت غیر محفوظ ہے۔ لڑکیاں شادی سے پہلے ماں بن جاتی ہیں۔ اور ٹوپے اور کوٹلے کی دوکانوں پر بھی عورت کا ننگا جسم بورڈ کی شکل میں لگایا جا رہا ہے۔

عورتوں کو زندہ جلایا جا رہا ہے پورے ہندوستان میں ایک سال ۱۹۸۵ء میں ۴۰۳ عورتیں جلائی گئیں۔ ان کی عصمت دری کی جاتی ہے چنانچہ یوپی میں ۱۹۸۵ء ایک سال میں اودن بیورو کے مطابق ۸۸۸، مدھیہ پردیش میں ۴۲۲، بہار میں ۳۲۹ عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں عورت فروخت کی جاتی ہے اور اس کے ناتواں کندھوں پر گھر اور دفتر دونوں کی ذمے داری ڈال کر مرد عیش کی بانسری بجاتا ہے اگر مرد کسی عورت سے کہے کہ تم نوکری بھی کرو اور گھر کا کام بھی تو وہ اس کے لئے راضی نہیں ہو گی، اس لئے ایک نعرہ اور ایک فلسفہ پیش کیا گیا کہ عورتیں مردوں سے پیچھے ہیں۔ ان کو مردوں کے برابر آنا چاہئے تاکہ جنس کی پیاس بھی بجھے اور ذمے داری کا بار بھی ہلکا ہو۔

اسلام ایک پاکیزہ تہذیب وتمدن کا داعی ہے اور ایک صالح اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں

جاتا ہے۔ اور یہ عورت مرد کے قلب و نظر کی پاکیزگی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

وہ عورت و مرد دونوں کے لئے ایک حد مقرر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے آگے مت جانا ورنہ معاشرہ گندہ ہو جائے گا اور تمدن بگڑ جائے گا اور فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے۔ اسلام کی نظر میں عورت و مرد دونوں برابر ہیں اور دونوں کا اپنا مقام ہے جس کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا اسلام میں عورت محترم، مقدس اور پاکیزہ ہستی ہے اس کی گود میں انبیاء، صلحاء، اولیاء پرورش پاتے ہیں اور یہ ایک صالح معاشرہ کی اکائی اور بنیاد ہے۔ اس کے بغیر کوئی پاکیزہ معاشرہ، اچھا سماج، بہترین تہذیب و تمدن پروان نہیں چڑھ سکتا۔ معاشرہ کی ایک عورت جتنی صالح ہوگی معاشرہ اتنا ہی اچھا ہوگا۔ یہ چیز کمیونزم اور ہندوازم کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس کا کوئی توڑ ہے بغیر اور اس ادارہ کو نابود و خراب کئے بغیر اسلامی تہذیب و ثقافت کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور یہ چیز دشمن بن کر حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ ہمدردی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ آخر شیطان نے بھی تو حضرت آدم کو ہمدرد بن کر ہی بہکایا تھا۔ دشمن سے ہوشیار رہنے والے اکثر دوست سے بہت جلد دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

اگر یہ عورتوں کے ہمدرد ہوتے تو وقف وراثت کے ذریعہ ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور سیکڑوں بہنوں کو بے سہارا کرتے۔ غریب، بے سہارا مظلوم عورتوں کے لئے بھی ان کے پاس کوئی پروگرام ہوتا اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے بھی کچھ کرتے۔ کیا صرف شاہ بانو ہی ایک عورت ہے زاہدہ، پروین جو فسادات میں بیوہ اور بے سہارا ہو گئیں وہ عورت نہیں۔ کیا وہ عورت نہیں جو جلا کر مار ڈالی گئیں۔ کیا فسادات میں وہ عورتیں نہیں جو مزدوری کرتے کرتے تھک جاتی ہیں پھر بھی ان کے بچے فاقہ کر کے سو جاتے ہیں؟ ہائے افسوس اس فکر، کردار پر اور عورت کی تڑپ اور درد پر۔

راجیو گاندھی نے مطلقہ عورت کے حقوق کی حفاظت کا بل پیش کر کے عورتوں سے محبت اور ہمدردی کا ثبوت تو دیا ہی ہے اپنی انسانیت اور خاندانی شرافت کا بھی ثبوت فراہم کیا ہے ہم راجیو گاندھی کی کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کو لوک سبھا کے اس سیشن میں ضرور منظور کروا لیں گے۔

ہندوستان میں کئی قومیں بستی اور رہتی ہیں۔ ان کا اپنا ایک پرسنل لا اور اپنی تہذیب اور تمدن ہے اس کے بغیر ان کی شناخت مشکل ہے۔ راجیو گاندھی اس بات سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ تمام قوموں کو اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کا موقع فراہم کرنا اور اس میں رکاوٹ نہ پیدا کرنا ہی اس ملک کے لئے مفید ہے اور ایسے ہی ہمارا ملک اور یہ قومیں پھل پھول سکتی ہیں۔ رہنما اصولوں کی دفعہ ۴۴ مسلمانوں کے سروں پر ایک تلوار بن کر لٹک رہی ہے اور مسلمان ہر وقت اس سے خائف رہتے ہیں۔ راجیو گاندھی اگر اس بات میں مخلص ہیں کہ وہ مسلم پرسنل لا میں مداخلت نہیں کریں گے تو وہ مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ کیوں نہیں قرار دیتے ہیں۔ اس میں لیت و لعل کیوں؟ ہم ان کی ذات سے امید رکھتے ہیں کہ وہ سنجیدگی سے غور کریں گے۔

اس وقت تمام ہندی مسلمانوں کی نگاہیں کانگریس آئی اور راجیو گاندھی پر لگی ہوئی ہیں وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس بل کا حشر کیا ہوگا اور راجیو گاندھی اپنے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کر پائیں گے کہ نہیں۔ اس کے بعد ہی وہ آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ دوسری طرف اپوزیشن پارٹیاں اور جارحانہ ہندو تنظیمیں راجیو کے خلاف سازشوں کا جال بن کر اپنا حلقہ تنگ کر رہی ہیں اب دیکھنا ہے کہ راجیو گاندھی کتنی تیزی کے ساتھ اور کتنی جلدی اس حلقہ سے نکلنے میں کامیاب ہوتے ہیں اسی پر ان کے اور کانگریس آئی کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ اب رہی ہماری اور مسلم پرسنل لا کی بات تو ہمیں اب یہ اصول سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ "موت سے آنکھیں چار کرنے والوں ہی کو زندگی کی ضمانت ملتی ہے بزدلوں کا وجود تو ہمیشہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا ہے۔"

خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔

فاروق ناز ...
۱۹۸۶/۲/۲

اہلِ قلم سے گزارش

"مضامین خوش خط صفحہ کے ایک ہی طرف لکھ کر روانہ کریں"

"ادارہ"

ہفت روزہ تکبیر پاکستان کے مدیر

ابو سفیان اصلاحی

جناب محمد صلاح الدین سے ایک انٹرویو

دوسری قسط

ج ۔ تصوف کی خالص اصطلاح تو خالصتہً مسلم ادب کی اصطلاح ہے، تصوف اور تزکیہ میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دراصل تزکیہ مقصود ہے۔ تصوف اس کا ذریعہ ہے، لیکن ہندو اور دنیا کی دوسری تہذیبوں نے تصوف کے تصورات کو ضرور متاثر کیا ہے، مثال کے طور پر اسلام رہبانیت نہیں ہے۔ تصوف تزکیہ کے لئے ہے ترک دنیا کے لئے نہیں، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لئے ہے کہ ہم صاف ستھرے اور اچھے معاشرہ میں زندگی بسر کریں، ہمارے نفس میں بگاڑ پیدا ہوا تو معاشرہ بگڑ جائے گا، فرد کا تزکیہ اس لئے مقصود ہے کہ ایک اچھا معاشرہ وجود میں آسکے اگر فرد کا نفس پاکیزہ نہیں ہے تو فرد اجتماعی زندگی میں بگاڑ کا سبب بنے گا، اگر فرد کو معاشرتی زندگی گزارنی ہے تو اسکی اصلاح کا کوئی ذریعہ ضرور ہونا چاہیئے، انھیں میں سے ایک طریقہ تصوف ہے، تصوف میں جن چیزوں پر زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ترک دنیا تو نہیں لذائذ دنیا سے احتراز کیا جائے، سادگی سے زندگی بسر کیجائے اس میں تول نہ ہو اور ایک Minimum (قلیل مقدار) پر زندگی بسر کر سکے، تو تصوف دراصل باطنی تقاضوں جو ہمیں لوٹ گھسوٹ کیطرف لے جاتے ہیں اس سے انحراف کرے اور ایک قناعت اور سادہ زندگی بسر کرنے کیطرف راغب کرے لیکن دو بڑی خرابیاں ہیں ہندوستان میں بھی اور دوسری جگہوں پر بھی وہ پیر پرستی اور قبر پرستی کا سلسلہ ہے اس کا تعلق تصوف سے نہیں ہے، اور دوسری چیز یہ کہ اسلام نے اطاعت کا مرکز صرف ایک رکھا ہے وہ نبی کریمؐ کی ذات گرامی ہے، تصوف کے لوگوں نے اپنی دنیا بنانے کے لئے (ہر محبت حضورؐ کے تابع ہونی چاہیئے، جہاں کوئی محبت آنحضورؐ کی محبت سے برتر ہو جائے اور اسکی اطاعت علی الاطاعت ہو جائے تو یہ کفر و شرک ہے) کوئی کہتا ہے کہ فلاں پیر صاحب کا قول آخر ہے خواہ وہ قرآن و

سنت کے مخالف ہی کیوں نہ ہو، علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں صوفیاء حضرات پر جو کچھ نقد کیا ہے درست ہے۔

س ۔ امام غزالی کی کتاب "منہاج العابدین" اور داتا گنج بخشؒ کی کتاب "کشف المحجوب" کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج ۔ کشف المحجوب میں توحید پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ تصوف کے کسی اور کتاب میں نہیں، آپ غوث الاعظمؒ جنھیں پیران پیر کہا جاتا ہے انکی کتابوں کا مرکزی خیال ہی توحید ہے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان سے عقیدت ظاہر کرنے والے اور ان کی تحریروں سے تعلق رکھنے والے اسی توحید پر پردے دبیز پردے ڈالے ہیں، کشف المحجوب

میں عبادت پر بے پناہ زور دیا گیا ہے یعنی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے، تصوف کی برصغیر میں جتنی کتابیں ہیں شاہ ولی اللہ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تزکیہ نفس پر بہت کافی زور دیا ہے، تصوف کی جتنی شاہکار کتابیں ہیں عبادات پر کافی زور دیا گیا ہے۔ ان کتابوں کا مرکزی مضمون توحید اور محبت رسولؐ ہے اور اللہ کے احکامات پر بڑا زور دیا گیا ہے، جو قرآن و سنت کا اتباع نہیں کرتا اس کا تصوف سے کوئی علاقہ نہیں ہے، بعض صوفیاء کی عملی زندگی کو ہم دیکھتے ہیں تو نقشہ کچھ اور نظر آتا ہے وہ نماز اور روزہ سے فارغ نظر آتے ہیں، وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ کسی پیر کے ہاتھ پر بیعت کر لینے سے وہ شرعی احکامات سے بری ہو جاتا ہے جبکہ اسلامی تصوف میں ان چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یعنی تصوف کوئی دیو مالائی چیز نہیں ہے۔

س ۔ صوفیاء کرام سماع کے قائل ہیں، بعض رقص کے بھی جبکہ آنحضورؐ فرماتے ہیں کہ "میں ڈھول توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہوں" تو آپ کا خیال؟

ج ۔ یہ ایک بڑی لمبی بحث ہے اس پر کچھ اختلاف بھی ہے اور کچھ گنجائش بھی، بعض لوگوں نے مولانا پھلواری جعفر صاحب نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے وہ موسیقی کے ماہر تھے انھوں نے جو موقف اختیار کیا ہے کہ اس میں کس قدر گنجائش ہے یہ بحث

دراصل چلی یہاں سے تھی کہ جس طرح ریڈیو اور ٹیلی ویژن آج کی دنیا کی ایجاد ہیں جس زمانے میں اسلام آیا تھا یہ چیزیں موجود نہیں تھیں یہ ذرائع ابلاغ ہیں جب دوسروں کے لئے استعمال ہو سکتی ہیں تو اسلام کے لئے بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔ صوفیائے کرام برصغیر میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں لوگوں کو جمع کرنے کے لئے دف بجایا جاتا ہے تو وہ غور سے سنتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں نے اس تکنیک کو اپنایا کہ لوگ دف کے ذریعہ جمع ہوں اور ہماری آواز زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے تو یہ ایک Instrument (اوزار) ہے جو ہم استعمال کرتے ہیں۔ محض Contact کے لئے کام چلاتے ہیں تاکہ بڑی تعداد میں لوگوں کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی جا سکے۔ یہ ایک دور میں ایسا Instrument تھا کہ جسکی آواز سنکر لوگ گھروں، گلی کوچوں اور کارخانوں سے نکلکر سننے کے لئے چلے آئے تو ہم نے دف کو استعمال کیا صرف Message convey (پیغام رسانی) کے لئے یہ طریقہ معین الدین چشتی اور دوسرے لوگوں نے بھی استعمال کیا۔ تو اگر اس کا مقصد صرف اللہ کے پیغام کا پہنچانا ہو تو یہ چیز اس فتوے کے تحت نہیں آتی کہ قطعاً حرام ہے اگر اس کا Motive (سبب) یہ ہو کہ لوگوں کو جمع کر کے ان تک اللہ کا پیغام پہنچایا جائے تو درست ہے اگر اس کا Motive یہ ہو کہ آدمی اپنی عبادات اور اپنے فرائض سے غافل ہو جائے، اپنے حواس کھو بیٹھے اور ایک نشہ طاری ہو اور جسکی وجہ سے ذکر الٰہی سے کٹ جائے تو ہرگز درست نہیں ہے۔ اسلام نشہ توڑنے کے لئے آیا ہے لیکن کوئی چیز مثال کے طور پر یہ ڈھول ہے ڈھول کو لوگوں کی خواہشات نفسانی کو ابھارنے کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں اور یہی طبل کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ اسی طبل کے ساتھ ساتھ نغمہ سناتے ہیں لوگوں کے فوجی اور مجاہدانہ کردار کو ابھارنے کے لئے تو جائز ہے تو اس کا سارا دارومدار اسکے Motive پر ہے۔ جس ڈھول سے ہمارے مجاہدوں نے محاذ آرائی کی ہے اور جسکی وجہ سے ان کے اعصاب میں توانائی آگئی ہے اور مضمحل ہونے سے بچایا ہے۔ مختصر یہ کہ رجز خوانی کے لئے درست ہے اور ہجو کرنے کے لئے حرام ہے۔

س۔ ایصال ثواب کے آپ قائل ہیں؟ مولانا مودودیؒ نے "رسائل و مسائل" میں لکھا

ہے کہ کچھ ائمہ اسکے قائل اور کچھ اسکے منکر ہیں ویسے بیشتر دلائل رد پر آتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ"۔

ج۔ ایصال ثواب کا یہ ایک مفہوم ہے کہ ایک شخص انتقال کر چکا ہے اور ہم کچھ ایسے کام کریں کہ جس کا ثواب اسے آخرت میں ملے اور مردہ کو اپنے اعمال کے نتائج سے دوچار ہونا پڑے اور باوجود اسے سزا ملنی ہے اس میں کمی ہو جائے گی تو ایک یہ ایصال ثواب ہے۔

ایک ایصال ثواب یہ ہے کہ ہمیں مرحوم سے قلبی تعلق ہے، عقیدت ہے۔ انکی ذات سے لگاؤ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ سے زیادہ سے زیادہ انکی مغفرت کی دعا کریں۔ میرے نزدیک مغفرت کی دعا ایصال ثواب ہے۔ اسی طرح اس کے لئے مغفرت کی دعا کریں جس طرح آنحضورؐ پر درود شریف پڑھتے ہیں۔ یہ درود شریف کیا ہے؟ یہ سلامتی ہے نبی کریمؐ کے لئے تو یہ سلامتی ہی ایصال ثواب ہے۔

اگر ایصال ثواب کا مفہوم یہ ہے کہ کچھ ہم رسم کریں اور اس رسم کے سبب مرحوم کے اعمال سیاہ کچھ کم ہو جائیں گے۔ اس سے بازپرس میں نرمی آجائے گی اور ہمارے اعمال ہمارے Account سے نکلکر اسکے Account میں چلے جائیں گے۔ اس ایصال ثواب کا تصور میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ میرے نزدیک ایصال ثواب یہ ہے کہ اپنے والدین، اپنے بھائیوں اور مسلمانوں کے لئے مغفرت کی دعا کریں اور اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلوص اور دعا کو قبول کر کے مرحوم کے ساتھ رحم اور مغفرت کا رویہ اختیار کرے، لیکن اسے آدمی جب ذہن میں بٹھا لیتا ہے کہ ہم نے جو اچھا کام کیا ہے لازماً اسکے گناہوں کو کم کرے گا تو یہ تصور سراسر غلط ہے۔ اللہ سے عاجزی کے ساتھ دعا کریں کہ اللہ ہمارے والدین اور ہماری امت پر رحم فرمائے تو اس حد تک میں ایصال ثواب کا قائل ہوں۔ یا ہم یہ کرتے ہیں کہ مرنے والا کچھ جائداد اور روپیہ چھوڑ گیا ہے تو ایک صورت تو یہ ہے کہ اسے ہم اپنے استعمال میں لائیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ اسکے چھوڑے ہوئے مال میں سے کسی یتیم کی شادی کرا دیں یا کوئی ایسا نیک کام کر دیں تو اس کا ایک فیض اسے آخرت میں ملے گا۔ لیکن اگر جبری تصور ہو کہ میں نے فلاں کام کیا ہے، میرے Account سے

اسے لازماً اتنا ثواب ملنا چاہیئے تو یہ درست نہیں۔

س۔ سورہ یٰسین کی آیت "قالو یا ویلنا من بعثنا من مرقدنا" کے پس منظر میں عذابِ قبر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ یہ ایسے معاملات ہیں کہ میں اس میں کسی کے بندھے فارمولے کا قائل نہیں ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے کہ وہ اپنے بندے کے ساتھ کیا کرتا ہے کوئی یہ فارمولا بنائے کہ کوئی ان ان اعمال کے ساتھ قبر میں جائے گا تو وہ لازماً اس عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا تو میں دو دو چار والے Formula (قاعدہ) کا قائل نہیں ہوں، سیدھی سی بات یہ ہے کہ مرتا یہ اللہ کا معاملہ ہے، عذاب قبر کے باب میں کبھی یہ ہوتا ہے کہ ایک بہت ہی چھوٹی نیکی کے سبب اللہ تعالیٰ اسکی ساری برائیوں کو معاف کر دیتا ہے اور کبھی کوئی جرم اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اسکے سبب وہ عذاب قبر کا مستحق بن جاتا ہے تو یہ معاملہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

س۔ آج کے سائنسی دور میں دعوت دین کا کام کس طرح کیا جائے؟

ج۔ سوالات تو آپ کے بہت مختصر ہیں لیکن اس کے جواب بہت طویل ہیں۔ دنیا میں چلنے والی ساری تحریکیں اسی پر غور و خوض کرتی ہیں دعوت دین کا کام جس طرح نبیؐ نے انجام دیا وہی طریقے ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ اس کا آغاز کس طرح ہوا کہ ایک باطل فکر کی جگہ لوگوں کو ایک صحیح عقیدہ دیا گیا یہ اس کا اولین مرحلہ ہے، جب وہ اس مرحلے سے گزرتا ہے کہ باطل اور فاسد خیالات کو ترک کر کے، حق پسندانہ خیالات کو قبول کرے، قبولیت حق کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے تربیت اور تعلیم کا، پہلے تبلیغ اور تبلیغ کے نتیجہ میں جو ایمان لے آئے اسکی تربیت، اسکے بعد ایک مرحلہ آتا ہے کہ جو اسے تعلیم و تربیت دی ہے اسے ایک معلومات کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے، اسکی زندگی کا جزء بن گیا ہے، مثلاً اس نے تعلیم کے ذریعہ یہ جان لیا ہے کہ جھوٹ بولنا ایک بری بات ہے اور سچ بولنا ایک اچھی عادت ہے یہ مرحلہ ہے تعلیم کا پھر یہ کہ اسے جزء زندگی بنایا ہے یا صرف تسخیر ہے اگر نہیں ہے تو یہی چیز ہے جس کا نام ہے تزکیہ، تزکیہ یہ ہے کہ جس چیز کو وہ حق سمجھتا ہے وہ اسکی زندگی

کا حصہ ہے کہ نہیں اگر باطل سمجھے تو اس کی زندگی سے خارج ہو جائے، اسکی سیرت کے اندر وحدت کا ایک ایسا رنگ غالب جائے جیسے اللہ چاہتا ہے تو تعلیم ایک معلومات مہیا کرتی ہے، تزکیہ ان چیزوں کو جزء زندگی بناتا ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جب اجتماعی زندگی وجود میں آ جائے تو تمام تعلیم کے باوجود کچھ نہ کچھ ایسے نفوس ضرور رہ جاتے ہیں کہ جنکے مجرمانہ رویے معاشرے کے لئے موجب خطر بنتے ہیں۔ تبلیغ کے ساتھ ساتھ جو چیز ہمیں اسلامی معاشرہ میں سب سے ضروری ہے وہ ہے مدرسہ کی اہمیت اور اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ آج تک جتنی تحریکیں چلی آ رہی ہیں انھوں نے تعلیم پر کافی زور دیا ہے، آپ دیکھیں گے کہ آنحضورؐ نے جہاں مسجد تعمیر کی وہیں پر مدرسہ کی بھی بنیاد ڈالی۔ ہمارے اسلامی معاشرہ میں آج یہ ہے کہ مسجد اور مدرسہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ عیسائیوں کا تصور ہے کہ انکی عبادت گاہ مدرسے سے الگ ہے، جہاں مسجد اور مدرسہ الگ الگ ہیں تو وہاں سیکولر نظام وجود میں آتا ہے کہ عبادت گاہ سجدہ کرنے کی جگہ ہے اور مدرسہ دنیاوی معاملات کی جگہ، ہمارے یہاں یہ ہے کہ مدرسہ بنتا ہے تو اسکی جگہ مسجد ضرور بنتی ہے تو وہاں مدرسہ ضرور بنتا ہے۔ مدرسہ میں سکھایا جاتا ہے کہ دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے، نماز اس طرح پڑھنا چاہیئے، تلاوت اس طرح کرنا چاہیئے جب سیکھ کر فارغ ہوتے ہیں تو مسجد۔ یعنی تجربہ گاہ بغل ہی میں ہے تو تجربہ کیا جاتا ہے کہ دیکھیں تربیت کے نتائج کیا سامنے آتے تو یہ مراحل ہیں جس سے ہمارا نظام تربیت مکمل ہوتا ہے۔

س۔ مولانا مودودیؒ سے آپ کی ملاقات کب ہوئی؟ کیا کوئی واقعہ بھی ان کا یاد ہے؟

ج۔ مولانا مودودیؒ سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۹ء میں بمقام کراچی ہوئی۔ پھر ان سے اتنی ملاقاتیں ہوئیں کہ اسے بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے، جب بھی لاہور جاتا تو مولانا اصرار کر کے اپنے گھر ہی پر ٹھہراتے، بیس پچیس بار کم از کم انکی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی، انکے ساتھ رات گزری، ناشتے کے، کھانا میں انکے ساتھ شریک رہا، راتیں تو بیشمار مولانا کے ساتھ گزریں، وہ بڑی شفقت فرماتے تھے، کراچی آتے تو لازماً ملاقات ہوتی، بھارت میں ایسے مسائل آتے کہ مولانا سے فون پر بھی کراچی سے رابطہ بار بار رہا تو ملاقاتوں کو تعداد کے ساتھ بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے، مولانا کا ایک واقعہ

کبھی میں فراموش نہیں کر سکتا، مولانا نے میری کتاب "بنیادی حقوق" پڑھی اور اس کا مقدمہ لکھا تو میں نے مولانا سے پوچھا کہ اسے کس ادارہ سے شائع کیا جائے تو مولانا نے عرض کیا کہ "ترجمان القرآن" (جو ان کا اپنا ادارہ ہے) سے شائع کروا دیجئے۔ اس پر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی۔ جب کتاب چھپکر آگئی۔ تو خواہش ہوئی کہ لاہور ہی میں اسکی ایک تقریب رونمائی ہو۔ میں نے رونمائی کا تذکرہ مولانا سے کیا تو مولانا نے کہا کہ میں علیل ہوں، اس تقریب کو کسی ہال اور ہوٹل میں رکھنے کے بجائے میرے گھر ہی پر رکھئے تاکہ میں بھی شریک ہو سکوں۔ یہ انکی طرف سے شفقت کا دوسرا مظاہرہ تھا، ہم نے اسکی تیاریاں شروع کر دیں، جب اسکی تاریخ آئی تو مولانا اور علیل ہو گئے، تقریب کے دن مولانا سے میں ملا تو مولانا پر اس قدر نقاہت طاری تھی کہ بستر سے اٹھ نہیں پا رہے تھے، مولانا مجھ سے معذرت کرنے لگے کہ آپ نے میرے ہی مشورے پر میرے گھر پہ تقریب کی لیکن بدقسمتی سے میں شریک نہیں ہو پا رہا ہوں۔ یہ ملاقات میری مولانا سے گیارہ بجے ہوئی اور تقریب شام ۶ بجے تھی، تقریب کی صدارت ایک ریٹائرڈ جج سپریم کورٹ کے کیکاؤس نے کی۔ جب تقریب اختتام کو پہنچنے والی تھی تو اچانک ہم نے دیکھا کہ مولانا دیوار کا سہارا لیتے ہوئے چلے آرہے ہیں، سچی بات یہ ہے کہ میں اس وقت اتنا جذباتی ہوا کہ انکی غیر معمولی شفقت کیوجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں مولانا کو سہارا دینے کے لئے بڑھا تو مولانا نے اشارہ سے منع کر دیا کہ ہم انہیں سہارا دیں جب وہ آئے تو اسٹیج پر رکھی ہوئی Leaning chair (جھکنے والی کرسی) پر بیٹھ گئے اور کہا کہ میری حالت ایسی تو نہ تھی کہ میں تقریب میں آتا جبکہ خود میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا، آپ لوگوں کی تقاریر کی آواز کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں صرف دعا کے لئے حاضر ہوا ہوں تقریر نہیں کروں گا، مولانا نے دوران دعا میرے لئے چند کلمات بطور دعا کہے۔ ہاں تو مولانا نے میری اس کتاب کو پڑھا، مقدمہ لکھا اور اپنے ہی ادارہ سے شائع کرنے کا حکم دیا اور پھر دعا کے لئے جو زحمت برداشت کی اسے تادم زیست کبھی فراموش نہیں کر سکتا، یہ ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گا۔

س۔ تحریک اسلامی اس وقت کس مرحلے میں ہے؟

ج۔ یہ سوال تحریک اسلامی کے قائدین سے کیجئے، اصل میں آپ کے سوالات بہت تفصیل طلب ہیں، تحریک اسلامی موجودہ حالت میں آگے بڑھی ہے کہ ماضی میں بننے والے سیاسی اداروں میں اسکی نمائندگی بہت کم رہی یا سرے سے رہی ہی نہیں مغربی پاکستان میں ہمارے دو ایک آدمی تھے، اسکے بعد یہ ہوا کہ اب ہماری قومی اسمبلی میں ایک تعداد ہے جو بارہ آدمیوں پر مشتمل ہے، ایسے ہی ہمارے چار آدمی ۱۹۷۰ء (مجلس انتظامیہ) میں بیٹھے ہوئے ہیں یہ پوزیشن ہماری پہلے نہیں تھی، مارشل لا کے باوجود بلدیاتی اداروں میں سینیٹ میں جماعت اسلامی کی پہلی بار Majority (اکثریت) ہے، دو بار الیکشن ہوئے اور دونوں بار اس شہر پر (کراچی) جماعت اسلامی کی حکومت ثابت قدم رہی یہ پاکستان کا سب سے عظیم شہر ہے، دوسرے شہروں میں بھی جماعت کا بڑا گہرا اثر ہے، بلدیاتی اداروں میں ہمارے گہرے اثرات پڑے ہیں، بھٹو صاحب کے دور میں ہمارے چار آدمی اسمبلی میں پہنچے جن میں سے ایک کو جام شہادت پلا دیا گیا، تین آدمی باقی رہ گئے تو یہ سلوک ہمارے ساتھ ہوتا رہا، تو یہ میں سمجھتا ہوں کہ سیاسی محاذ پر آگے بڑھی ہے، اسکے ووٹرز بڑھے ہیں، جو لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ مارشل لا نے ہمیں کافی نقصان پہنچایا ہے تو میں انکی رائے سے اتفاق نہیں کروں گا، صحیح اسلامی نظام کے لئے دو چیزیں درکار ہیں درست نظام اور درست آدمی، تاریخ میں ہوا یہ ہے کہ کبھی نظام درست ہوتا ہے تو آدمی درست نہیں ہوتا اور کبھی آدمی درست ہوتا ہے تو نظام درست نہیں ہوتا، تاریخ میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک آدمی کیوجہ سے سارا معاشرہ بدل جاتا ہے، بنی امیہ کا دور ملوکیت کا دور ہے اس میں ایک عمر بن عبدالعزیز آجاتے ہیں جبکہ نظام وہی ہے لیکن ایک فرد کی ذاتی خوبیاں اور ذاتی سیرت سے اس نظام کی ساری خرابیاں دور ہو جاتی ہیں، ایک ایسے نظام حکومت میں تبدیل کر دیتا ہے کہ اس دور کو خلافت راشدہ کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے، اسی طرح بادشاہت کا نظام اسلامی نظام نہیں ہے لیکن اس میں کبھی صلاح الدین ایوبی آجاتے ہیں تو اس نظام کے سارے نقائص ناپید ہو جاتے ہیں، اسلام کو شوکت، قوت اور غلبہ نصیب ہوتا ہے، اسی طرح مغلوں کے دور میں آجائیے تو مغلیہ

دور حکومت میں ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو قرآن کی کتابت اور ٹوپیاں بنا کر اپنی معاش کی کوشش کرتے ہیں تو نظام وہی ہوتا ہے لیکن بیچ میں جب اورنگ زیب آتے ہیں تو مملکت کا رنگ بدل جاتا ہے، اکبر اعظم آتے ہیں تو نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ہے اور دین الٰہی آتا ہے جبکہ نظام وہی ہے، ہمارے ملک میں آئے مارشل لا تین آدمیوں نے لگایا ایوب خان یحییٰ خان، اور ضیاء الحق صاحب نے لیکن یہ مارشل لا کیا ہمارے سامنے یکساں ماحول لیکر آتا ہے، یحییٰ خان کا مارشل لا زنا شراب اور فحاشی لیکر آتا ہے اور اسلام کے دوسرے احکام پر کوئی توجہ نہیں ہوئی، ضیاء صاحب کا بھی وہی مارشل ہے لیکن اس میں کچھ نفاذ شریعت کی بات ہوتی ہے، کچھ اقامت صلوٰۃ کی بات ہوتی ہے اور کچھ شرعی عدالت پر بات ہوتی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کام بہت مستحکم ہے اور مضبوط ہے لیکن مجموعی ماحول اس سے ضرور تبدیل ہوتا ہے اور بے دینی، عریانی اور فحاشی میں کمی ہوتی ہے، شریفانہ ماحول آرہا ہے، ہم سب کا مطالبہ ہے جمہوریت کا، جمہوریت تو ہمارے یہاں پوری شان و شوکت سے آئی، بھٹو صاحب آئے تو جمہوریت تھی، اس میں دستور بھی تھا، اسمبلی بھی تھی لیکن اس جمہوریت کے سر پر ہوا شخص چونکہ خود ذاتی طور پر گندا تھا تو اس جمہوریت نے ہمیں کچھ دینے کے بجائے ہم سے بہت کچھ چھین لیا، اس جمہوریت نے لوگوں کی عزت نفس کو کچلا، طلبہ اور علماء کے ساتھ بڑا برا سلوک ہوا، یہ ہماری تاریخ کا بڑا بھیانک دور تھا، اس شخص نے جمہوریت کو آمریت میں تبدیل کر دیا۔ تو کبھی یہ ہوتا ہے کہ نظام غنیمت ہے تو فرد غلط ہے اور کبھی فرد غنیمت ہے تو نظام غلط ہے، اس لئے فرد کی شخصیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہم بہت ہو کر نظام نظام کی گفتگو کرتے ہیں لیکن فرد کی خوبی و خامی کو ترک کر دیتے ہیں کوئی بھی آجاتے، بھٹو صاحب آگئے، انکی جمہوریت نے ہمیں کیا دیا، اس لئے جب ہم آج جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو دور اندیشی سے غور کرنا چاہئے کہ وہ اگر آئے گی تو حکمرانی کیسے لوگوں کے قبضہ میں آئے گی اگر وہ بالکل بدترین لوگوں کو ہمارے سر پر مسلط کر دے تو ایسی جمہوریت لاحاصل ہے، تو جمہوریت نہیں ہے تو فضول ہے، آپ کے یہاں اندرا گاندھی کی جمہوریت نے کیا دیا، محض نظام سب

کچھ نہیں ہے جبتک اسکے ساتھ اچھے افراد نہ ہوں، راجیو گاندھی اور نہرو جی دونوں جمہوریت کے علمبردار ہیں لیکن دونوں کی جمہوریت میں جو فرق ملتا ہے وہ افراد کا فرق ہے

س۔ یارسول اللہ کہنا کیسا ہے؟ تمام ہی مسلمان نماز "تشہد" پڑھتے ہوئے "السلام علیک یاایھا النبی" پڑھتے ہیں، جبکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ "انک میت وانھم میتون"

ج۔ اس کو چھوڑیئے۔ قرآن تو کہتا ہے آنحضورؐ اور لوگوں کی طرح ایک بشر ہیں۔ پھر ان کو نذیر کہتا ہے اور بشیر و نذیر کے ساتھ ساتھ بشر بھی قرار دیتا ہے، آنحضورؐ کے باب میں یہ سب بحثیں لایعنی ہیں بات ایک ہے کوئی کچھ بھی تصور قائم کرے وہ آخری حد تک جہاں جا کر رکے گا وہ یہ ہے کہ بعد خدا نبی کریمؐ کی ذات ہے۔ بدترین سے بدترین مسلمان کو نہیں دیکھا کہ وہ آنحضورؐ کو کسی سے کمتر تصور کرے تو میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ دینے سے رہا۔

س۔ "السلام علیکم یا اھل القبور" کیا حدیث سے ثابت ہے تو قرآن کی آیت "انک لا تسمع الموتیٰ" کا کیا مفہوم ہے؟

ج۔ اسے چھوڑیئے۔

س۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ "نطفہ رحم میں پہنچکر چالیس دن کے بعد منجمد خون بنتا ہے پھر وہ لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے، اسکے بعد اللہ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے کہ جاؤ اور لوتھڑے کے اعمال، زندگی، رزق، موت، سعادت و شقاوت کا فیصلہ ابھی لکھو اور اسکے بعد روح پھونکی جاتی ہے" یہ تو ہوئی حدیث اسی مفہوم ارشاد ربانی ہے "ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا ان ذالک علی اللہ یسیر لکیلا تاسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتٰکم واللہ لا یحب کل مختال فخور" قرآن و حدیث کی روشنی میں معلوم ہوا کہ انسان ہر اچھا برا کام اللہ کے حکم سے کرتا ہے تو پھر یہ جنت، دوزخ کا کیا مفہوم؟

ج۔ انسان اللہ تعالیٰ کی واحد مخلوق ہے جسے تمام دوسری صفات کے ساتھ اسے قوت ارادی بھی بخشی گئی ہے یہ واحد مخلوق ہے کہ جو صرف جبلی کردار نہیں رکھتی بلکہ عقلی اور شعوری

کردار بھی رکھتی ہے، یہ واحد مخلوق ہے کہ جسے ترک و اختیار کا ملکہ عطا کیا گیا ہے، چاہے کسی چیز کو قبول کرے اور چاہے اسے ترک کرے، ترک و اختیار ہی کی وجہ سے اسکے لئے جزا و سزا ہے اب اگر آپ کسی مخلوق کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہوں کہ لگا بندھا اسکے لئے ایک نامۂ اعمال تیار کر دیا گیا ہے تو جزاء و سزا اور جنت و دوزخ کے سارے تصورات لایعنی ہیں، نہ جنت میری کمائی اور نہ دوزخ۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں جو کچھ اپنی زندگی میں کرنے والا ہوں اللہ تعالیٰ کو اس کا پیشگی علم ہے، اس کے باوجود ایک گھنٹہ پہلے میں جو کچھ کرنے والا ہوں شاید مجھے بھی علم نہ ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ فوری طور پر ہمارے سامنے ایک ایسی صورتحال آجائے کہ جس صورتحال کا ذہن میں میں نے کوئی تصور قائم نہیں کیا ہو کہ دفتر سے نکلکر سڑک پر جاؤں گا تو آنے والی گاڑی مجھے فوٹ پاتھ پر کچل ڈالے گی لیکن اچانک ایک ایسی صورت پیش آتی ہے کہ میں اپنی منصوبہ بندی کے علاوہ بہت سے ایسے کام انجام دیتا ہوں جو بالکل غیر متوقع ہوتے ہیں جنکی منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اعمال جو میرے علم میں نہیں اور مجھ سے سرزد ہوتے ہیں۔ ان اعمال کی پیشگی کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اسے معلوم ہے کہ ایک گھنٹہ بعد مجھ پر کیا گزرنے والی ہے، اسے معلوم ہے کہ میں جب ۴۴ سال دس مہینے آٹھ روز کا ہوں گا تو میں کن اعمال اور کن حرکات سے گزروں گا۔ میرے اعمال کا علم ہونا الگ بات ہے اور جبری کنٹرول کرنا الگ کہ میں وہی کروں گا جو میں پہلے سے مقدر ہے تو جزاء و سزا کے سارے تصور عبث ہیں۔ جزاء و سزا منحصر ہے ارادے اور اختیار پر، اگر میرا اسلام جبری ہے تو کسی کافر کا کفر جبری ہے تو اس بیچارے کو سزا اور مجھے جزا دینا عقل سے ماوراء ہے۔

حضرت علیؓ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک جگہ ایک بدوی نے ان سے سوال کیا کہ قضا و قدر کا مسئلہ میری سمجھ میں نہیں آتا تو آپ نے فرمایا کہ حضور اکرمؐ نے اس مسئلہ پر بحث کرنے سے منع کر دیا ہے کیونکہ اس میں بڑی پیچیدگی ہے۔ لیکن اس بدو کو سمجھانے کے لئے آپ نے کہا کہ تم اپنا دایاں پیر زمین سے اوپر اٹھاؤ، اس نے اٹھا لیا پھر آپ نے کہا اپنا بایاں پیر اوپر اٹھاؤ تو اس نے کہا کہ یہ تو نہیں اٹھتا تو آپ نے کہا کہ یہ تیری تقدیر تھی اور وہ تیری تدبیر ہے جہاں پہنچکر انسان اپنی ساری صلاحیت، شعور و علم لگا دیتے کے

باوجود ناکام ہو جاتا ہے، میں نے اپنے ارادے کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا یہ بھی حضرت علیؓ کا قول ہے تو یہ ہے قضاء و قدر کا معاملہ لیکن اگر میں دایاں پیر بھی اٹھانے پر قادر نہ ہوں یہ بھی کسی کے اٹھانے سے اٹھتا ہے تو اللہ کی طرف سے کچھ قوانین فطرت ہیں، جو قوتیں ہمیں دی گئی ہیں اور اعضاء و جوارح دیکر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہم انھیں کس رخ پر لگائیں۔ اگر معاملہ جبری ہوتا تو بعثت انبیاء بھی غلط ہی ہے، کتاب اور انبیاء و رسل اس لئے اتارے گئے ہیں کہ اس سے حق و باطل کا پتہ لگایا جا سکے کہ کیا سچ اور کیا جھوٹ ہے، کیا معروف اور کیا منکر ہے۔ اس کے سامنے دو راہیں کشادہ کر دی گئی ہیں اور اس کا پتہ ہمیں کتاب اور سیرت پاک سے لگا ہے، پھر انسان کو اسکے عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے حق پر چلے اور چاہے باطل کو اختیار کرے، ورنہ یہ سارا جزا و سزا کا معاملہ لایعنی قرار پائے گا۔

س ۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج ۔ مولانا فراہیؒ کے بارے میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ اس دور میں قرآن کریم سے متعلق جو ان کا ایک خاص کارنامہ ہے یہ بہت بڑا ان کا Contribution (حصہ) ہے وہ ہے ترتیب نزول قرآن کریم، کہ اسکی کیا ترتیب تھی اور اسکی ترتیب بعد کس طرح تبدیل کی گئی قرآن کریم کے سلسلے میں ان کا یہ کام بڑا مستحکم ہے ایک تو نزول قرآن کے باب میں اور دوسرے قرآن فہمی کے باب میں، تفسیر فراہیؒ میں جس طرح قرآن کریم کے مفہوم و معنی کو کھولا گیا ہے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اس دور پر Apply کیا ہے، دوسرے مفسرین کے یہاں یہ ہے کہ وہ دوسروں کی آراء اور قدماء کے خیالات کو جمع کرتے ہیں لیکن انھیں جو علم عطا کیا گیا ہے اسے آج کے حالات پر منطبق کریں تاکہ آج کے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں یہ ان لوگوں کے یہاں نہیں پایا جاتا یہ بات ہمیں مولانا فراہیؒ کے یہاں ملتی ہے۔ اس باب میں ان کا اپنا ایک مدرسہ فکر School ہے جو وجود میں آچکا ہے، اسے "فکر فراہیؒ" کے نام سے جانا جاتا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ نظم قرآنی انکا اپنا تنہا عظیم کارنامہ ہے۔

سمیع اختر
عربک ڈیپارٹمنٹ علی گڑھ

قرآن اور اس کی سحر انگیزی

نزول قرآن

قرآن مجید وہ واحد مقدس، منفرد، اور یکتائے روزگار کتاب ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا۔ اور اسے دیگر آسمانی صحیفوں کی طرح راہبوں اور مذہبی اجارہ داروں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ دیا کہ وہ اپنی مرضی وخواہش کے مطابق ان صحیفوں کے اندر جو ترمیم واضافے، تحریف اور رد و بدل کرنا چاہے کریں بلکہ اس کو من وعن تا قیامت اپنے اصلی حالت پر باقی رکھنے کی پوری ذمہ داری لی۔ پورا قرآن تیئیس سال کی طویل مدت میں حسب ضرورت مکی ومدنی زندگی میں آپؐ کے اوپر نازل فرمایا۔

قرآن ہی عربی ادب وفن کا وہ واحد سرچشمہ ہے کہ جب اس کا نزول شروع ہوا تو وقت کے کہنہ مشق ادباء وشعراء اس کے ادب عالی کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اسکی سحر انگیزی جادو بیانی اور اثر آفرینی نے نہ صرف مومنین کو متاثر کیا بلکہ ہر ادبی ذوق رکھنے والے شخص نے اسکی ادبی حیثیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ مخالفین قریش اور منکرین اسلام اسکی جادو بیانی سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں اس کے پیش کرنے والے کو ساحر، شاعر اور کاہن کہنا شروع کر دیا جب کہ اس اعلیٰ وارفع کلام الٰہی کی کسی بھی انسانی کلام سے ادنیٰ مشابہت نہ تھی۔ آخر کار ہار کر انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس قرآن پر کان مت دھرو بلکہ اس کی تلاوت کے وقت شور وغل کرو تاکہ تم غالب آجاؤ۔

مدون ادبی سرمایہ

یہ کہنا کہ نزول قرآن سے قبل عربوں کے پاس کسی قسم کا کوئی ادبی سرمایہ موجود نہ تھا کسی طرح بھی درست نہ ہوگا کیونکہ تاریخ بتاتی ہے کہ نزول قرآن سے قبل بھی اشعار وخطبات کی شکل میں اچھا خاصا ادبی سرمایہ موجود تھا مگر اس کا تر انحصار لوگوں کی زبانی روایتوں، قوت حافظہ اور یادداشتوں پر تھا۔ اس کے باوجود اس جاہلی دور کا ادبی سرمایہ جو ہم تک پہونچا ہے وہ آج تک عربی ادب کے لئے گراں قدر تحفہ ہے اور ادباء کے لئے مشعل راہ ہے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی اپنی جگہ مبنی بر حقیقت ہے کہ قرآن سے قبل تک عربوں کے پاس مدون ومرتب شکل میں کوئی ادبی سرمایہ موجود نہ تھا بلکہ جو کچھ بھی تھا وہ منتشر اور بکھرا ہوا تھا۔ عربی ادب کے کسی مرتب ومدون شکل میں منظر عام پر آنے کا سہرا قرآن کے سر ہے۔ قرآن کے مذہبی ودینی تقدس اور برتری سے قطع نظر خالص ادبی وفنی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ پہلا ادبی صحیفہ ہے جو عربی ادب میں، ابواب، فصلوں، آیتوں اور اوقاف کے ساتھ کتابی شکل میں مدون کیا گیا۔

سب سے پہلی سورت

نبوت سے سرفراز ہونے سے قبل آخری زمانے میں آپؐ بہت زیادہ پریشان رہنے لگے تھے۔ اور آپؐ کو اپنے گھر اور اپنے ارد گرد کے ماحول میں کسی طرح بھی سکون وقرار میسر نہ آتا تھا بلکہ ہر وقت ایک عجیب وغریب قسم کے اضطراب وبے چینی سے دوچار رہتے تھے۔ چنانچہ اطمینان وسکون کی غرض سے آپؐ آبادی سے دور تشریف لے جاتے اور غار حرا میں عبادت وریاضت میں مشغول ہو جاتے۔ اسی اثنا میں آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اور وحی اترنے کا سلسلہ شروع ہوا اور سب سے پہلی سورت "العلق" حضرت جبرئیل علیہ السلام لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

قرآن شریف میں کل چھوٹی بڑی سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ ہے۔ ان میں سے اکیانوے مکہ میں اور تیئیس مدینہ میں نازل ہوئیں۔ ہر سورہ میں چھوٹی بڑی آیتیں ہیں۔ جن کی تعداد "بسم اللہ" کو چھوڑ کر چھ ہزار دو سو دو ہے۔ تلاوت میں آسانی کی غرض سے پورے

قرآن کو تیس پاروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔[1]

موضوعات و تعلیمات

سورتوں کے مکی و مدنی ہونے کے اعتبار سے ان کے مضامین اور معانی میں تنوع ہے۔

مکی دور میں قرآنی آیات و تعلیمات کا خاص موضوع بھی توحید کی دعوت اور آخرت سے انذار رہا ہے۔ خدائے واحد کی بلا شرکت غیر عبادت و پرستش پر زور دیتے ہوئے تمام ہی جھوٹے خداؤں، من گھڑت اصنام اور باطل ادیان و مذاہب کی پرزور تردید کی گئی ہے۔ اسکے واحد، حکیم، بصیر اور قادر مطلق ہونے پر آفاق و انفس سے بہتر سے دلائل دیے گئے ہیں۔ جنت و جہنم، ثواب و گناہ، عقاب و جزا کا انوکھا تصور پیش کیا گیا ہے۔ نیز اعلیٰ اخلاق، انسانی اور سماجی اقدار کی تعلیم دی گئی ہے۔

مدنی سورتوں میں عبادات و معاملات سے متعلق احکام و قوانین کی تفصیل ہے۔ دین اسلام کے بنیادی ارکان کو واضح کرتے ہوئے ایک آئیڈیل اسلامی اسٹیٹ کے اصول و مبادی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ملکی و بین الاقوامی سیاسی و حکومتی، معاشرتی و سماجی اور اقتصادی و معاشی اصول و ضوابط کی تشریح ہے۔

قرآن حسن و اعجاز کا سنگم ہے۔ یہ کتاب ابھی اب تک کے موجود تمام ہی ادبی ذخائر میں اپنی نفاست و عمدگی، فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی اور حسن و زیبائش کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ہم ذیل میں اس کی لغوی و نحوی باریکیوں، فقہی و شرعی نکات، سائنسی و جغرافیائی اصولوں سے بحث نہ کرتے ہوئے صرف قرآن کی ادبی و فنی خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

عربی زبان و ادب پر قرآن کا اثر

نزول قرآن کے بعد عربی زبان و ادب نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ نقادوں اور ادیبوں کے نزدیک یہ امر متفق علیہ ہے کہ اگر قرآن کا نزول نہ ہوا ہوتا تو عربوں کے پاس آج عربی ادب نام کی کوئی چیز نہ ہوتی۔ اس سے قبل مختلف عربی قبائل مختلف لہجوں میں گفتگو کیا

[1] ڈاکٹر شوقی ضیف۔ تاریخ ادب العربی ص ۲۰

کیا کرتے تھے۔ یمنیوں کی زبان حجازیوں کی زبان سے اتنی مختلف تھی کہ ان کے درمیان کہیں سے کوئی تال میل نظر نہ آتا تھا۔ یہ قرآن ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ مخصوص عربی لہجے (قریشی لہجے) میں نازل ہوا اور اس نے عربی زبان کے مختلف لب و لہجے کے الگ الگ اصول و مبادی کے مقابلے میں صرف ایک لہجہ کو پیش کیا اور تمام عرب کو اسی پر متحد و متفق کر دیا یہاں تک کہ سارا عرب اسی ایک لہجے میں تلاوت کرنے لگا۔ اس طرح سے قرآن کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سارے لہجے ختم ہو گئے اور ایک لہجہ یعنی قریشی لہجہ باقی رہ گیا اور شعر و ادب کی زبان بھی قریشی لہجہ بن گئی۔

قرآنی اسلوب اور اسکے انداز بیان کا عربی زبان پر خاص اثر یہ ہوا کہ اس نے عربی زبان کے اندر ایک خاص قسم کی انفرادیت پیدا کر دی۔ اس نے عربی زبان کا دامن نہ صرف یہ کہ نئے الفاظ سے بھر دیا اور ان کے معانی متعین کئے بلکہ بعض پرانے الفاظ کے معانی و مطالب کو وسعت و گہرائی دی اور بعض کے معنی بدل کر نئے معنی پہنائے جیسے فرقان، کفر، ایمان، شرک، نفاق، اسلام ان الفاظ کو مخصوص معانی میں استعمال کرنے کا سہرا قرآن کے سر ہے اسی طرح سے وہ الفاظ جو پہلے سے عربی میں موجود تھے لیکن نئے اور مخصوص معنوں میں عربی زبان میں بالکل نئے الفاظ کی طرح شامل ہوئے۔ اور ان کے معانی رائج معنوں سے بالکل مختلف ہو گئے، مثال کے طور پر "صلوٰۃ" کا معنی عربی زبان میں صرف دعا کے لئے ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اسے مسلمانوں کے مخصوص طریقۂ عبادت کے لئے مخصوص کر دیا اب صلوٰۃ کا لفظ نہ تو صرف "دعا" اور نہ ہی دوسرے مذاہب و ادیان کے طریقۂ عبادت کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ اسی طرح لفظ "صوم" جس کے معنی کسی کام سے رک جانا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اسے مخصوص طریقہ اور چند قیود و شرائط کے ساتھ کھانے پینے اور بعض دیگر بشری ضروریات سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک رکے رہنے کے لئے مخصوص کر دیا۔ اسی طرح زکوٰۃ کے معنی پاک صاف کرنے کے ہیں مگر قرآن نے اسے ایک خاص قسم کے مالی ٹیکس کے لئے مخصوص کر دیا۔ یہی حال حج، مومن، کافر، فاسق، منافق جیسے الفاظ کا بھی ہے۔ ان الفاظ کے مخصوص اصطلاحی معانی متعین ہو گئے جو اب کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتے۔

عربی زبان پر احسان

قرآن کریم کا عربی زبان پر یہ احسان ہی کچھ کم نہ تھا کہ اس نے اس کو لب ولہجے کی یگانگت، الفاظ ومعانی کی جدت، اسلوب وترکیب کی نزاکت، فکر وخیال کی عظمت اور تشبیہ وتمثیل کی ندرت عطا کی مگر قرآن کریم کا عربی زبان پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اسے دیگر سابقہ زبانوں کی طرح ایک خاص مدت کے بعد گردش زمانہ کے ہاتھوں خرد برد ہو کر ختم ہونے سے بچالیا۔

دنیا کی ہر زبان ایک خاص مدت اور ایک خاص زمانے تک عروج وترقی کے مراحل طے کرتی ہے۔ پھر اس زبان کے اوپر ایک ایسا دور آتا ہے کہ وہ اپنے نقطہ عروج پر پہونچ جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ زبان تغیر وتبدل کا شکار ہوتی ہے اور قوم کے زوال وانحطاط کے ساتھ وہ زبان بھی اپنی قدر وقیمت اور اپنی اصلیت کھو دیتی ہے اور پھر اس زبان کا وجود بھی صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ جیسا کہ عبرانی وسامی زبانوں کے ساتھ ہوا کہ ایک خاص زمانے میں ان کا سکہ پوری دنیا پر چل گیا اور ہر جگہ بولی وسمجھی جانے لگی اور پھر اسکے اوپر وہ دور بھی آیا کہ کوئی اسکا نام لیوا بھی نہ رہ گیا۔ مگر عربی زبان کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہوا اور اسی قرآن کی وجہ سے آج چودہ صدی گذر جانے کے بعد بھی عربی زبان پورے آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔

عربی زبان جو کہ صرف جزیرہ عرب کے بعض علاقوں تک محدود تھی اور اسے دیگر ترقی یافتہ زبانوں (رومی، عبرانی، سامی) کے مقابلہ میں کوئی ادبی وفنی حیثیت حاصل نہ تھی مگر قرآن کے نزول کے ساتھ ہی وہ مکہ کی سنگلاخ وادیوں سے نکل کر اطراف واکناف میں دور دراز تک پھیلتی چلی گئی اور بہت قلیل مدت میں بہت سارے علاقوں میں بولی اور سمجھی جانے لگی۔ وقت کے تمام ہی نامور ومختار ادباء وشعراء نے اسکی ادبی وفنی حیثیت کو تسلیم کیا۔ بقول الحاج الصدوق "زبان عربی مختصر سے عرصے میں علاقائی زبان سے عالمی حیثیت اختیار کر گئی۔"

یہ قرآن ہی کا احسان ہے کہ آج چودہ صدی گذر جانے کے بعد بھی اس زبان کے اندر وہی حلاوت وشیرینی، سلاست وروانی موجود ہے جو کہ کل تھی۔ مسلمانوں کے دینی جذبہ کو مجروح کرنے، ان کا رشتہ دین ابراہیمی سے کاٹنے، ان کے دینی وملی تشخص کو ختم کرنے

ان کی ثقافتی وتہذیبی انفرادیت کو ختم کرنے، سیاسی تفوق وبرتری کو منتشر کرنے کے لیے اسلام دشمن عناصر نے جہاں دوسری چیزوں کو نشانہ بنایا وہیں عربی زبان وادب پر بھی مختلف راستوں سے حملہ کیا اور ان کا رشتہ اصل عربی زبان سے کاٹنے کی کوشش کی۔ اور تاریخ کا یہ اصول اپنی جگہ مسلم ہے کہ جس قوم کا تعلق اس کی زبان سے کٹ جاتا ہے تو پھر اسے قعر ذلت میں گرنے اور خرد برد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ استعماری وسامراجی قوتوں نے اس سلسلے میں منظم طور پر کوششیں کیں کہ عربوں کے اندر علاقائی وعامی زبانوں کو رائج کیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ عربی مبین سے ان کا رشتہ از خود کٹ جائیگا۔ اس سلسلے میں ان کی کوششیں ضرور بار آور ہو جاتیں اگر قرآن عربی زبان کی حفاظت نہ کرتا۔ [2]

سحر انگیزی

قرآن کریم نے آغاز نزول ہی سے عربوں پر اپنی سحر طرازی وجادو بیانی کا سکہ جما دیا تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کرتے تھے تو اس کا ہر لفظ اور اسکی ہر آیت سننے والے کے دل ودماغ میں خواہ وہ آپ کا ہمنوا ہوتا یا دشمن اس طرح اترتی چلی جاتی کہ وہ اس سے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ کٹر سے کٹر دشمن بھی اس کی جادو بیانی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مکی زندگی کے ابتدائی دور میں چند حضرات (حضرت خدیجہؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت زیدؓ) کو چھوڑ کر حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں کی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو قرآن کی سحر انگیز قوت سے متاثر ہوئے تھے۔

کفار قریش جب آپؐ کی سرگرمیوں سے تنگ آگئے آپ کے اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف ہر طرح کے جور وستم کو آزما کر دیکھ لیا مگر پھر بھی جب وہ لوگ اپنے مشن سے باز نہ آئے تو پھر تمام سرداران قریش نے باہم مشورے سے ولید بن مغیرہ کو اپنا نمائندہ بنا کر آپؐ

---

[2] لیکن یہ امر باعث مسرت ہے کہ عالم عرب میں اب ایسی تحریکیں فروغ پا رہی ہیں جو اس چال کو ناکام بنانے کی جد وجہد میں مصروف ہیں چنانچہ خالص عربیت پر زور، غیر ملکی الفاظ کے استعمال پر پابندی، غیر ملکی تلفظ سے نفرت کا اظہار بڑا ہی، خاص طور سے اخوان المسلمون نے اس کے خلاف زبردست مہم شروع کر رکھی ہے علامہ یوسف قرضاوی، علامہ محمد الغزالی وغیرہ اس تحریک کے روح رواں ہیں

کے پاس بات چیت کے لئے روانہ کیا تاکہ وہ کسی معاملے پر آپ سے معاہدہ کر لے۔ ولید بن مغیرہ جو آپؐ کا بدترین دشمن تھا جب آپؐ کے پاس پہنچا تو اس وقت آپؐ تلاوت میں مشغول تھے۔ اسکے پردہ گوش سے بعض آیتیں ٹکرائیں جن کو سن کر وہ اس درجہ مسحور ہوا کہ سنتا چلا گیا اور یہ بھول گیا کہ وہ کس مقصد کے لئے یہاں آیا تھا۔ آیات سننے کے بعد بغیر کچھ بات چیت کئے ہوئے وہ سرداران قریش کے پاس واپس جا پہونچا اور سب کے سامنے یہ کلمات دوہرائے یعنی خدا کی قسم میں نے محمدؐ کو ایسا کلام پڑھتے سنا ہے جو نہ انسانوں کا کلام ہو سکتا ہے اور نہ ہی جنات کا اس میں تو بڑی مٹھاس بڑا بانکپن اور دلکشی ہے اور اس کا اوپر کا حصہ (ظاہری الفاظ) بڑا پھلدار (سامعہ نواز و حسین) ہے اور نچلا حصہ بڑا گہرے پانی والا ہے (یعنی معانی و مطالب کے اعتبار سے بہت گہرا ہے)

چنانچہ جب ولید بن مغیرہ کے اندر قرآنی آیات کو سننے کے بعد رقت طاری ہوئی اور علی الاعلان اس نے قرآن کے متعلق مثبت انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تو سرداران قریش کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آباؤ اجداد کے دین سے پھر جائے ان لوگوں نے باہم مشورے کے بعد ابو جہل کو اسکے پاس قرآن سے نفرت پیدا کرانے کے لئے بھیجا، ابو جہل نے کہا اے ولید! جب تک تم قرآن کی مذمت نہیں کروگے اس وقت تک تم سے تمہاری قوم راضی نہ ہوگی۔ تمہاری سرداری چھن جائے گی، تو ولید نے کہا مجھے سوچنے کا موقع دو۔ سوچ وچار کے بعد بولا یہ تو جادو ہے جو نقل کیا جا رہا ہے تم دیکھتے نہیں کہ قرآن اپنے متبعین کو ان کے اعزہ و اقارب سے کاٹ دیتا ہے۔ قرآن کریم اسی ضمن میں فرماتا ہے۔

إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ (مدثر ۲۴-۱۸)

(اس شخص نے سوچا اور ایک بات تجویز کی اس پر خدا کی مار ہو اس نے کیسی بات تجویز کی، خدا کی لعنت ہو اس نے کیسی بات تجویز کی۔ اس نے پھر غور کیا، پھر منہ بنایا اور منہ کو بسورا، پھر منہ پھیر لیا اور تکبر کا اظہار کیا پھر بولا یہ تو جادو ہے جو نقل کیا جا رہا ہے)

اسی طرح معلقات کے مشہور شاعر اعشیٰ قیس کے متعلق روایت ہے کہ فتح مکہ سے

قبل جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر آپؐ سے ملنے کے لئے حجاز روانہ ہوا تو سرداران قریش نے اسے راستے ہی میں جا لیا اور اس خوف اور اندیشہ سے کہ آپ سے ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد اسکی سحر انگیزی سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے اسے ایک سو اونٹ دے کر اس کے وطن یمامہ واپس بھیج دیا۔

اسی طرح مغیرہ بن شعبہ اپنے کانوں میں روئی ڈال کر کعبہ کے سامنے سے گذرتا تھا کہ مبادا اسکے کانوں میں قرآن کی سحر کن آواز پڑ جائے اور اس سے متاثر ہو کر اپنے آبائی دین کو چھوڑ بیٹھے۔

پھر حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کا واقعہ تو اس کے سحر انگیزی کی سب سے بڑی دلیل ہے حضرت عمرؓ جو اسلام، مسلمانوں اور خود آنحضرتؐ کے جانی دشمن تھے۔ ان کی اسلام دشمنی ضرب المثل تھی۔ ایک روز اپنے ہاتھ میں ننگی تلوار لئے آپؐ کا قصہ تمام کرنے کی غرض سے گھر سے نکلے۔ راستے میں کسی نے خبر دی کہ محمدؐ کو تو بعد میں ختم کرنا پہلے اپنے بہن و بہنوئی کی خبر لو وہ اسلام لا چکے ہیں۔ چنانچہ شدید غصے کی حالت میں اپنی بہن کے گھر پہونچے تو خبر کی تصدیق ہو گئی باہر ہی قرآن کی آواز سن لی شدید غصہ سے بہن اور بہنوئی کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا۔ جب ان کی بہن نے یہ کہا کہ "اے عمرؓ چاہے جان سے مار ڈالو اب یہ نشہ نہیں اتر سکتا" عمرؓ چونک گئے اور انہوں نے بھی اس کلام کو سننے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ سورہ طٰہٰ کی آیات ان کو پڑھ کر سنائی گئیں عمرؓ ان آیات کی سحر انگیزی و اثر آفرینی کی تاب نہ لاتے ہوئے بے اختیار چلا اٹھے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صرف قرآن کی چند آیات نے ان کے اوپر وہ اثر کیا کہ ان کے دل کی دنیا تبدیل ہو کر رہ گئی۔

یہ چند واقعات ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ قرآنی آیات کے اندر کس قدر سحر انگیزی و جادو بیانی موجود ہے۔ اور آغاز اسلام میں اس نے اپنی اسی قوت کو استعمال کرتے ہوئے کس حد تک لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ قرآن کے علاوہ کسی کلام کے اندر سحر انگیزی کا یہ عنصر موجود نہیں ہے کہ سامع کو پہلی ہی فرصت میں اپنا گرویدہ بنا لے۔

چنانچہ کفار قریش جب اسکے مقابلے سے عاجز آگئے اور اس سحر کا کوئی توڑ نہ پیش

کرسکے تو انہوں نے ایک طرح سے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے اسکی تلاوت کے وقت شور و غل مچانے کا پروپگنڈہ شروع کر دیا۔

"لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون" ( )

اس قرآن کو مت سنو اس میں شور و غل مچاؤ تاکہ تم غالب آجاؤ یہ آیت کفار قریش کا قرآن کے متعلق مطلق اضطراب و بے چینی، خوف و اندیشہ کی طرف دلالت کرتی ہے ان کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ اگر قرآن کے سلسلے میں شور و غل سے کام نہ لیا گیا تو لوگ اسکی سحر انگیزی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

مگر یہاں ایک بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ قرآن کے اندر جو سحر انگیزی ہے وہ بالکل ممتاز و منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اسکا جنوں کی مخصوص بولیوں، کاہنوں کے الہامات اور جادوگروں کے منتروں سے کوئی تعلق نہ تھا۔

کئے جانے کے فیصلہ کے خلاف فضا ہموار کر کے موجودہ سیکولر نظام سے عوام کا اعتماد ختم کیا جاسکتا ہے یا برہنی چودھراہٹ یعنی حکومت ہند کی متعصبانہ پالیسی کا نقاب الٹا جاسکتا ہے اور اس سے اسلام کے حق میں بیداری پیدا ہو رہی ہے۔

شاعری کا کالم کچھ کمزور ہے۔ حامد علی ساحر صاحب کا مضمون محنت سے مرتب کیا گیا ہے لیکن بہت طویل ہے۔

والسلام

عبید اللہ فہد

بقیہ صفحہ ۱۵ پر

حیات نو کو گھر گھر پہنچایئے

غزل

حفیظ میرٹھی

ہمیں نہیں گے تمہارے بھی ترجماں لوگو
ذرا تم اشک تو چھلکاؤ بے زباں لوگو

تمہارا خون بہا ہے جہاں تہاں لوگو
مگر یہ خون نہ جائے گا رائگاں لوگو

خدا کا شکر کہ محفل میں ذکر دار چھڑا
ہمیں تو آنے لگی تھیں جماہیاں لوگو

لگی تھی ٹھیس ہی کچھ تیز و تند لہجوں کی
بکھر کے رہ گئیں شیشہ مزاجیاں لوگو

نکالنے ہیں تمہیں خود ہی پاؤں سے کانٹے
پلٹ کے تم کو نہ دیکھے گا کارواں لوگو

بنا دیا ہے بھکاری شراب نے اس کو
کہاں ہوا تھا یہ زخمی گرا کہاں لوگو

بغیر معجزہ یوں چھوٹتے نہیں چشمے
کوئی رگڑتا رہے لاکھ ایڑیاں لوگو

جو چاہتے ہو کہ تاریخ تابناک رہے
ملا دو خاک میں اپنی جوانیاں لوگو

وہیں وہیں نظر آیا ہے سربلند حفیظ
پڑی ہے سر کی ضرورت جہاں جہاں لوگو

مسلم خواتین

(طلاق کے بعد حقوق کے تحفظ کا) بل ۱۹۸۶ء

اس بل کا مقصد ان مسلم خواتین کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے جنھیں ان کے شوہروں نے طلاق دی ہو یا جنھوں نے خود طلاق حاصل کی ہو نیز اس کا مقصد متعلقہ امور یا اتفاقی طور پر پیدا ہونے والے مسائل کا حل تلاش کرنا بھی ہے۔

نام اور دائرہ نفاذ:- (دفعہ ۱، ۲، ۳) اس قانون کو مسلم خواتین (طلاق کے بعد حقوق کے تحفظ) کے قانون کا نام دیا جا سکتا ہے۔

(۲) یہ ریاست جموں اور کشمیر کو چھوڑ کر پورے ملک میں نافذ ہوگا۔

تعریف:- دفعہ (۲) اس قانون میں اگر سیاق و سباق کے تقاضے کچھ اور نہ ہوں تو

(الف) "مطلقہ عورت" سے مراد وہ عورت ہوگی جس کی شادی مسلم قانون کے مطابق ہوئی ہو۔ اور جسے اس کے شوہر نے مسلم قانون کے مطابق طلاق دی ہو یا جس نے خود طلاق حاصل کی ہو۔

(ب) مطلقہ عورت کے تعلق سے "مدت عدت" سے مراد ہے:

(i) اگر وہ حائضہ ہو تو طلاق کی تاریخ کے بعد تین دوران حیض

(ii) اگر اسے حیض نہ آتا ہو تو طلاق کے بعد تین قمری مہینے

(iii) اگر وہ طلاق کے وقت حاملہ ہو تو طلاق سے لے کر بچہ کی ولادت یا خاتمۂ حمل تک کے درمیان کی مدت۔ دونوں میں جو بھی پہلے ہو۔

(ج) مجسٹریٹ سے مراد ہے ایک فرسٹ کلاس مجسٹریٹ جو ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء کے تحت اس علاقہ میں جہاں مطلقہ عورت کی سکونت ہو عملاً اختیار سماعت رکھتا ہو۔

مسلمان عورت کا مہر یا دوسرے اثاثے جنکی وہ طلاق کے بعد حقدار ہوگی

(۳) ۱- فی الوقت نافذ العمل کسی دوسرے قانون میں شامل کسی بات کے باوجود ایک مطلقہ

عورت حقدار ہوگی۔

(الف) معقول اور مناسب نان و نفقہ جو اسے عدت کی مدت کے دوران اس کے سابق شوہر کی جانب سے فراہم اور ادا کیا جائے گا۔

(ب) اگر وہ خود ان بچوں کی کفالت کرتی ہے جو اس کے یہاں طلاق سے پہلے یا اس کے بعد پیدا ہوئے ہیں تو اس کے سابق شوہر کی طرف سے ان بچوں کی پیدائش کی تاریخوں سے دو سال تک کے عرصہ تک اس کے لئے معقول اور مناسب نان و نفقہ کا بندوبست اور اس کی ادائگی کی جائے۔

(ج) مہر کی مالیت کے بقدر رقم جس کی مسلم قانون کے مطابق اس کی شادی کے وقت اسے ادائگی طے کی گئی ہو۔ اور (د) ان تمام اشیاء و املاک کی جو اسے شادی کے وقت یا اس سے پہلے یا شادی کے بعد اس کے رشتہ داروں یا دوستوں یا شوہر یا شوہر کے رشتہ داروں یا دوستوں کی جانب سے دی گئی ہوں۔

(۲) اگر معقول و مناسب نان و نفقہ یا واجب الادا مہر کی رقم کی فراہمی یا ادائگی یا ان اشیاء کی سپردگی طلاق کے بعد مطلقہ عورت کو نہ کی گئی ہو۔ جن کا ذکر ذیلی دفعہ ۱ کے ذیلی سکشن د میں کیا گیا ہے تو وہ یا اس کی طرف سے اس کا کوئی باضابطہ نمائندہ مذکورہ نان و نفقہ یا مہر کی ادائگی یا املاک کی سپردگی کا، اس میں سے جو بھی صورت ہو حکم جاری کرنے کے لئے مجسٹریٹ کو درخواست دے سکتا ہے۔

(۳) ذیلی دفعہ ۲ کے تحت مطلقہ عورت کی طرف سے دی جانے والی درخواست اگر مجسٹریٹ مطمئن ہو کر (الف) معقول ذرائع آمدنی کے باوجود اس کے شوہر نے عدت کی مدت کے دوران اسے اور اس کے بچوں کے لئے معقول و مناسب نان و نفقہ کا بندوبست نہیں کیا ہے یا

(ب) مہر کی رقم ادا نہیں کی گئی ہے یا ذیلی دفعہ ۱ کے ذیلی سکشن (د) میں مذکور اشیاء و املاک اس کے حوالے نہیں کی گئی ہیں (تو وہ) عذرداری کی تاریخ سے ایک ماہ کے اندر اندر حکم جاری کر کے سابق شوہر کو یہ ہدایت دے سکتا ہے کہ وہ مطلقہ خاتون کو معقول و مناسب نفقہ کا بندوبست کرے اور اس کو ادا کرے جو اس کی (مجسٹریٹ) نظر میں مطلقہ عورت کی ضرورت

شادی کے وقت اس کے معیار زندگی اور سابق شوہر کے ذرائع آمدنی سے مطابقت رکھتا ہو یا اگر معاملہ مہر کی ادائیگی یا مطلقہ عورت کو ذیلی دفعہ ۱ کے ذیلی سیکشن (د) میں مذکور اشیاء و املاک کی سپردگی کا ہو تو مجسٹریٹ مذکور کا حکم ان سے متعلق ہوگا۔

اگر مجسٹریٹ کے لئے مذکورہ مدت عدت کے اندر اندر متعلقہ درخواست پر فیصلہ صادر کرنا ممکن نہ ہو تو وہ اس کے اسباب کو ضبط تحریر میں لاکر اس مدت کے بعد بھی اپنے احکام جاری کر سکتا ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا شخص جس کے خلاف ذیلی دفعہ ۳ کے تحت حکم جاری کیا گیا ہے کسی معقول عذر کے بغیر اس کی تعمیل میں ناکام رہتا ہے تو مجسٹریٹ ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء کے تحت جرمانہ کی وصولیابی کے طریقوں پر عمل کرتے ہوئے نفقہ یا مہر کی جملہ رقوم کی وصولیابی کیلئے وارنٹ جاری کر سکتا ہے۔ وارنٹ کی تعمیل کے بعد بھی اگر رقم کی کلی طور پر ادائیگی نہیں ہوتی یا اس کا کوئی جزو واجب الادا رہ جاتا ہے تو مجسٹریٹ متعلقہ شخص کو ایک سال تک کی یا اگر ادائیگی جلد کر دی جاتی ہے تو ادائیگی سے ما قبل مدت تک کی سزا دے سکتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیا جائے اور سزا ضابطہ فوجداری ۱۹۷۳ء کی دفعات کے تحت دی جائے۔

نفقہ کی ادائیگی کا حکم:۔ دفعہ ۴ (۱) زیر تذکرہ قانون کی مذکورہ بالا دفعات یا فی الوقت نافذ کسی قانون کے مندرجات سے قطع نظر اگر کوئی مجسٹریٹ اس بات پر مطمئن ہے کہ مطلقہ عورت نے دوبارہ شادی نہیں کی ہے۔ اور عدت کی مدت کے بعد اپنی کفالت آپ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے تو وہ ایک آرڈر جاری کر کے ان رشتہ داروں کو جو اس کی موت کے بعد مسلم قانون کے مطابق اس کے ترکہ کے وارث ہو سکتے ہوں یا ہو سکتی ہوں ہدایت دے سکتا ہے کہ وہ اس کے لئے نفقہ کا بندوبست کریں اور دیں جو اس کی (مجسٹریٹ) کی نظر میں مطلقہ خاتون کی ضرورتوں، شادی کے دوران اس کے معیار زندگی اور متعلقہ رشتہ داروں کے ذرائع آمدنی کے پیش نظر معقول و مناسب قرار پاتا ہو۔ یہ رشتہ دار گذارہ کی رقم مطلقہ کے ترکہ میں اپنے حصہ کے تناسب سے ادا کریں گے۔ اور ادائیگی کی مدت یا وقفہ کی صراحت متعلقہ

آرڈر میں کی جائے گی۔

اگر اس طرح کا کوئی رشتہ دار مجسٹریٹ کے حکم کے تحت نفقہ کی واجب الادا رقم میں اپنا حصہ بہ اعتبار وسائل ادا کرنے سے معذور ہو تو مجسٹریٹ اس کی معذوری کا ثبوت مل جانے پر یہ حکم جاری کر سکتا ہے کہ اس کا حصہ وہ دوسرے رشتہ دار ادا کریں جو اس کی (مجسٹریٹ) نظر میں اس کے اہل ہوں۔ اس ادائیگی کا تناسب کیا ہوگا اس کی صراحت مجسٹریٹ اپنے آرڈر میں اپنی صوابدید سے کرے گا۔

(۲) اگر کوئی مطلقہ عورت اپنی کفالت آپ کر سکتی ہو اور ایسے رشتہ دار بھی نہ ہوں جن کا تذکرہ ذیلی دفعہ ۱ میں کیا گیا ہے یا اس طرح کے رشتہ دار یا ان میں سے کوئی ایک اپنے ذرائع آمدنی کے اعتبار سے اس لائق نہ ہو کہ مجسٹریٹ کے حکم کے تحت متعین کردہ گذارہ کی رقم میں اپنا حصہ ادا کر سکے یا اگر وہ دوسرے رشتہ دار بھی جنہیں مجسٹریٹ نے ذیلی دفعہ ۱ کے تحت معذور رشتہ داروں کے حصہ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے اپنے ذرائع آمدنی کے اعتبار سے اس کی ادائیگی سے قاصر ہوں تو مجسٹریٹ ایک آرڈر جاری کر کے وقف قانون ۱۹۵۴ء کے تحت تشکیل دئے جانے والے یا کسی ریاست میں فی الوقت نافذ کسی اور قانون کے تحت وجود میں آنے والے ریاستی وقف بورڈ کو جو متعلقہ مطلقہ خاتون کی جائے سکونت کا احاطہ کرتا ہو، ہدایت دے سکتا ہے کہ وہ ذیلی دفعہ ۱ کے تحت اس کے ذریعہ متعین کردہ نفقہ کی رقم ادا کرے یا ادائیگی سے معذور رشتہ داروں کا حصہ ادا کرے جو بھی معاملہ ہو، ادائیگی کی مدت اور وقفہ کا تعین اس کے آرڈر میں کیا جائے گا۔ ......

بقیہ "ایڈیٹر کے نام ایک خط"

نہیں لکھنا چاہئے ہم اس ابن الوقتی کے شدید مخالف ہیں جہاں ضرورت پڑنے پر ایک چیز کو قرآن و سنت کی روشنی میں حرام قرار دیں پھر خیالات کی تبدیلی کے ساتھ حلال کر لیں۔

" ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی
کیا ہے حافظ رنگیں نوا نے راز یہ فاش "

ابوالمجاہد زاہد

غزل

بے طلب ہی دینے والے نے مجھے کیا کیا دیا ⁂ عقل بخشی چشم روشن دی دل بینا دیا
کرب تنہائی کا چہرہ اور بھی چمکا دیا ⁂ تیرگی کے شکل و بیخ روشنی نے کیا دیا
اس شجر کو بھی بالآخر آپ نے کٹوا دیا ⁂ جس شجر نے زندگی بھر پھل دیئے سایہ دیا
زندگی سے کچھ نہ دینے کی شکایت کیا کروں ⁂ سوچتا ہوں میں نے خود بھی زندگی کو کیا دیا
آندھیاں بن بن کے اٹھتے ہیں بجھانے کیلئے ⁂ کھل رہا ہے شب پرستوں کو میرا جلتا دیا
میں گرا تو وہ بڑھا مجھ کو اٹھانے کے لئے ⁂ بھیڑ میں دانستہ خود جس نے مجھے دھکا دیا

حل تو زاہد خیر کیا کرتے زمیں کے مسئلے
اہل دانش نے انھیں کچھ اور بھی الجھا دیا

ابوالمجاہد زاہد

غزل

اس طرح کو چال معتبر ہو جائیے ⁂ جب نقاب اٹھے تو سراپا نظر ہو جائیے
خود کو روشن کیجئے خود جلوہ گر ہو جائیے ⁂ اپنی صبح و شام کے شمس و قمر ہو جائیے
حق پرست و حق شعار و حق نگر ہو جائیے ⁂ ملت کے ماحول میں نور سحر ہو جائیے
دھوپ کے ماروں کو جب کی چھاؤں میں دیتے رہے ⁂ ریگزار زندگی میں وہ شجر ہو جائیے
دیکھ کر انسان پر انسان کے ظلم و ستم ⁂ جی میں آتا ہے کہ محروم نظر ہو جائیے
لوگ چاہیں جس کی تحریریں حوالوں کے لئے ⁂ زندگی کی وہ کتاب معتبر ہو جائیے

خاک ہونا ہی مقدر میں ہے زاہد تو پھر
خاک پائے سید والا گہر ہو جائیے

ڈاکٹر عبدالباری فلاحی علیگ

جندیشاپور کا قدیم مدرسہ اور
طب کی ترقی میں اسکا حصہ

جندیشاپور خوزستان کا ایک شہر تھا جو شوستر اور دزفول کے مابین واقع تھا اس علاقہ کی آب و ہوا نہایت معتدل تھی اسلئے شاپور بن اردشیر (۲۴۰ یا ۲۴۱ تا ۲۷۲ء) نے اسکی تعمیر کروائی جب شاپور کو روم پر فتح حاصل ہوئی تو وہاں رومی قیدیوں کو آباد کیا اور اپنی فوج کو بھی مقرر کر دیا۔

حمزۃ الاصفہانی کا خیال ہے کہ جندی شاپور دراصل اندیوشاپور کا معرب ہے جسکا مطلب ہے کہ یہ شہر انطاکیہ سے بہتر ہے[۳]

ابن المقفع کی رائے کے مطابق اسکا نام [illegible]

۱ معجم البلدان جلد ۲ ص ۱۷۰
۲ قیصر روم کا نام [illegible] تھا
۳ شاپور [illegible] میں [illegible] اور ۲۴۱ میں روم پر حملہ کیا اس وقت قیصر گارڈین تھا
(۲۳۸-۲۴۴) [illegible] روم پر حکمراں تھا

الناکیہ پر قبضہ کر لیا تو شاہ ایران نے صلح
کی درخواست کی اور استحکام صلح کے لئے
قیصر روم کی لڑکی سے شادی کا ارادہ ظاہر
کیا چنانچہ قیصر روم نے اسکو قبول کر لیا اور
لڑکی کو ایران بھیجنے سے قبل اس نے یہ شہر
تعمیر کروایا اور قسطنطنیہ سے جو کاریگر آئے
تھے ان میں یونانی طبیب بھی تھے جن کی
وجہ سے جندی شاپور طب کا مرکز بن گیا
اور اطباء نے جندی شاپور کو اپنا وطن بنالیا
بعض کا خیال ہے کہ یہ علاقہ جندا نامی شخص
کی جاگیر میں تھا شاپور نے جب اس قطعہ
اراضی پر ایک شہر آباد کرنا چاہا تو اس نے
اراضی فروخت کرنے سے انکار کر دیا لیکن
بڑی مشکل سے اس پر رضامند ہوا کہ
شہر کا جو نام قرار پائے اس میں اس کا نام
بھی شامل رہے چنانچہ کام شروع ہو گیا
جب وہ گذرتے پوچھتے کہ یہ کون بنوا رہا ہے
تو کاریگر کہتے جند او ساپور لہذا شاپور
نے اپنے اور جندا کے نام کی مناسبت
سے اس شہر کا نام جندی شاپور رکھا۔
جب بادشاہ کی لڑکی وہاں منتقل ہوئی
تو اسکے ساتھ شہر کی وہ تمام چیزیں گئیں
جن کی اس لڑکی کو ضرورت پیش آ سکتی
تھی اسکے ساتھ فاضل اطباء بھی گئے جب
وہاں وہ لوگ قیام پذیر ہوئے تو اہل شہر
نے سیکھنا شروع کر دیا اس سے ان کے
علم میں اضافہ ہوا اور انھوں نے اپنے شہر یا
کے مزاج کے مطابق قوانین علاج مرتب
کرنا شروع کر دیئے۔ ہر قوم سے فائدہ اٹھایا
اس فن میں یہاں تک کمال پیدا کیا کہ دنیا
نے انکو اطباء ہند و یونان سے بھی زیادہ
قابل سمجھنا شروع کر دیا۔ ان حضرات
کی تصانیف انکے کمال فن پر شاہد ہیں
بادشاہ کسریٰ کے حکم سے جندیشاپور کے
تمام اطباء ایرانی دربار میں جمع ہوتے اور
انکے درمیان چند روز تک طبی مسائل پر گفتگو
ہوتی رہی۔"[1]

مسلمانوں نے اس شہر کو ۱۹ ہجری مطابق
[illegible]ء میں فتح کیا جو خوزستان کے شہروں
میں شمار کیا جاتا تھا اور اس وقت
مشہور ساسانی حکمران ہرمزان کے قلمرو میں
شامل تھا۔ ہرمزان اس وقت شاہ اہواز
کے نام سے مشہور تھا۔ قادسیہ میں ایرانیوں
اور مسلمانوں کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی۔

[1] اخبار الحکماء از قفطی مترجم غلام جیلانی برق مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۵ء ص ۱۹۰ — ۱۹۶

اس میں ہرمزان خود شریک تھا لیکن شکست اور ناکامی
کے بعد وہ اپنے دارالسلطنت خوزستان
چلا گیا اور ان مسلمانوں سے دوبارہ جنگ کرنی
پڑی جو عراق کے جنوب سے میشان کے
علاقہ کی طرف چلے آئے تھے بارہا جنگ
ہونے کے بعد فتح ہوئی اور ایک معاہدہ
طے ہوا جسکی رو سے اہواز مہرجانقذق
کا علاقہ ہرمزان کے قبضہ میں ہی باقی رہا
لیکن یہ صلح نامہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور ہرمزان
نے اہواز سے نکل کر پھر عربوں پر حملہ
کیا عتبہ اپنا لشکر لے کر مقابلہ کو آیا اور
ہرمزان کو دریا کے کناروں سے باہر دھکیل
کر اہواز پر قبضہ کر لیا ہرمزان ایک بار
پھر فوج منظم کر کے رام ہرمز کے مقام
پر عربوں سے مقابلے کے لئے آیا لیکن
یہاں بھی اس نے منھ کی کھائی اور پسپا
ہو کر شوستر میں پناہ لی۔ جو خوزستان
کا صدر مقام تھا عتبہ اسکے تعاقب میں شوستر آیا اور
شہر کا محاصرہ کر لیا۔
محاصرہ ۸ ماہ تک جاری رہا آخر رسد
کی کمی کی وجہ سے اہل قلعہ نے ہتھیار ڈال
دیئے اور شہر مسخر ہو گیا یہاں ہرمزان
اسیر ہو گیا اور اسے مدینہ بھیج دیا گیا[1]
جب مسلمانوں نے شوستر پر قبضہ
کر لیا اور ہرمزان کو گرفتار کر لیا گیا تو جند
یشاپور نے اپنے اندر مقابلہ کی تاب نہ لا کر
اپنا شہر مسلمانوں کے حوالہ کر دیا تاکہ جان و
مال عزت آبرو کو ٹھیس نہ لگے اس طرح
سے جندیشاپور ظلم و بربریت سے اور قتل و سفا
کی سے محفوظ رہا اور طبی درسگاہ اور دارالشفا
پر کوئی ضرب نہیں آئی۔

ساسانی اداروں میں یہ ادارہ غالباً
ایسا تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں صحیح
سالم پہونچ گیا۔

آخری واقعہ جس میں جندیشاپور کا
نام آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب یعقوب بن
لیث الصفاری نے خراسان سیستان اور
فارس کو فتح کرنے کے بعد خوزستان
کو فتح کرنا چاہا اس کی جانب ایک لشکر
لے کر روانہ ہوا۔ اور جندیشاپور میں قیام
کیا اور وہاں عمال کو پریشان کرنے لگا
یہ واقعہ ۲۶۲ھ اور ۲۶۵ھ کے درمیان
کا ہے[2]

" یعقوب کا وہیں پر انتقال ہوا اسکا
انتقال colic کی وجہ سے ہوا۔
Enema ڈاکٹروں نے بتایا حقنہ

[1] تاریخ ایران جلد اول
[2] طبری جلد ۶ ص ۳۲

کے علاوہ اس مرض کا کوئی دوسرا علاج نہیں ہے لیکن اس نے حقنہ سے انکار کیا اور مرجانا ہی پسند کیا۔ یہ آفت ناگہانی ایک ہچکی کے ساتھ آئی۔

یاقوت (متوفی ۶۲۶ھ) کا کہنا ہے کہ وہ اس مقام سے کئی بار گزرا لیکن اسکے ایام زندگی میں مشہور تاریخی مقامات میں سے چند کھنڈروں کے سوا کچھ باقی نہ تھا جو ایک ماضی کی یاد دلاتے تھے پھر بھی ۱۳۳۰ء تک ایک قصبہ کا وجود تھا جیسا کہ القزوینی کہتا ہے کہ یہ متوسط درجہ کا قصبہ تھا اور بہت زیادہ گنے کی پیداوار ہوتی تھی۔ اب صرف کھنڈرات باقی ہیں اور اسکو شاہ آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔[1]

مدرسہ کا قیام ترقی اور اہمیت

عہد ساسانی دراصل جندیشاپوری طب کا دور ہے جسکا سلسلہ ۲۲۶ء سے شروع ہو کر ۶۳۲ء تک ختم ہو جاتا ہے ساسانی خاندان نے ۴۲۲ سال تک حکومت کی اور اسی دوران جہاں اس نے ایرانی روایات کو زندہ کیا، زرتشتی مذہب کی از سر نو تشکیل کی وہیں جندیشاپور میں بھی مدرسہ کی بنیاد شاپور ثانی (۳۰۹ء — ۳۷۹ء) نے ڈالی[2]۔ البتہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اسکا قیام صحیح طور سے کب عمل میں آیا اسکی تاریخ پانچویں صدی یا چوتھی صدی عیسوی بھی ہو سکتی ہے۔ بازنطینی حکومت سے تنگ آکر ایڈیسہ کے نسطوریوں نے ۴۸۹ء میں یہاں اقامت اختیار کی اور اسکے بعد ایتھنز کے جدید فلسفہ افلاطون کے حامیوں نے بھی افلاطونی مکاتب بند ہو جانے کی وجہ سے ۵۲۹ء میں جندیشاپور میں پناہ لی۔ نسطوری اپنے ساتھ طبی کتب کا شامی ترجمہ لائے اور نو افلاطونی فلاسفہ فلسفیانہ خیالات لائے۔[3]

کچھ ہی دنوں بعد کسریٰ نوشیروان (نوشیروان عادل ۵۳۱ء — ۵۷۸ء) جس نے ایتھنز میں مدرسہ فلسفہ کے بند ہو جانے کے بعد مہاجر یونانی فلاسفروں

[1] میڈیکل ہسٹری آف پرشیا از الگوڈ مطبوعہ کیمبرج ۱۹۵۱ء ص ۴۹

[2] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مرتب [illegible] جلد دوم ص ۱۰۰ مطبوعہ لندن ۱۹۰۹ء

[3] انٹروڈکشن ٹو ہسٹری آف سائنس از جارج سارٹن جلد اول ص ۴۳۵ مطبوعہ ۱۹۵۳ء

کی میزبانی کی تھی اس لئے مدرسہ طبیہ کو زرخیز بنایا اور اپنے وزیر اعظم برزویہ کو ہندوستانی کتب کے مختلف علوم و فنون حاصل کرنے کے لئے ہندوستان روانہ کیا وہ جب واپس ہوا تو اسکے ساتھ ہندوستان کی کتابیں، ادویہ، فنون اور اطباء بھی تھے نوشیروان کے حکم سے زہر سے متعلق ۳۰ جلدوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی گئی متعدد ہندوستانی کتابوں کا پہلوی (قدیم فارسی) زبان میں ترجمہ کیا گیا تقریباً ۵۵۰ء میں طب کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے اطباء کی ایک عمومی میٹنگ منعقد ہوئی۔

طبی نقطۂ نظر سے ساسانی حکمرانوں میں سب سے عظیم بادشاہ نوشیروان تھا جسکو مغربی مصنفین Chosroes the great اور اہل عرب کسریٰ کہتے ہیں یہ Kai Kahau کا تیسرا محبوب بیٹا تھا۔ اس نے تقریباً ۴۸ سال حکومت کی۔ اسکی شہرت سنتے یونان کے جلاوطنوں کو پرشیا آنے پر مجبور کر دیا تھا اور اسی وجہ سے یونانی اثرات کافی مستحکم ہوئے۔ مدرسہ میں تعلیم کا ذریعہ صرف یونانی زبان ہی نہیں تھی بلکہ پہلوی اور سریانی زبان بھی رائج تھی، اسی طرح سے نظام طب بھی خالص یونانی نہیں تھا بلکہ فارسی، یونانی اور ہندوستانی طب کا مجموعہ تھا۔[1]

یہ ایک مسلم امر ہے کہ نوشیروان کے دور حکومت میں یہ اسکول بام عروج پر تھا کیونکہ وہ خود علم کا شوق رکھتا تھا۔ الگوڈ (Elgood) کہتا ہے کہ اسکا دور تراجم کے لئے مشہور تھا یونان اور ہندوستان کے مشہور مصنفین کی کتاب کا فارسی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ بالخصوص افلاطون اور ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔[2]

عہد اسلامی اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب اہل عرب نے ایران کو ۶۵۲ء میں فتح کیا چنانچہ عرب نے ایران پر یلغار

[1] انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد دوم ص ۸۶۰

[2] اے میڈیکل ہسٹری آف پرشیا مطبوعہ کیمبرج ۱۹۵۱ء ص ۵۱

کیا تھا اس وقت جندیشاپور کا طبی مدرسہ
بہت ہی شان سے چل رہا تھا اور مسلمانوں
کے ہاتھوں میں ۶۳۶ء میں آیا اسکے بعد
بھی یہ ڈیڑھ سو سال تک چلتا رہا اور پھر
عالم اسلام میں طبی تعلیم کا عظیم مرکز بنا
اس مدرسے کا آخری کارنامہ یہ تھا کہ ۸۶۹ء
میں سب سے پہلا فارماکوپیا شائع ہوا جو
سارے عالم میں استعمال کیا گیا[1]

الگوڈ (Elgood) کہتا ہے
کہ اہل عرب کے یلغار کے دوران پرشیا
میں طب کی ترقی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا
اور اگرچہ جندیشاپور کا مدرسہ قائم رہا لیکن
حارث بن کلدہ کی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک
واپسی اور جورجیس اول کی خلیفہ منصور کی
خدمت گزاری کے دوران جو وقفہ ہے اس
میں کسی ایسے فرد کا نام تاریخ میں نہیں ملتا
ہے جس نے اس مدرسہ کی ترقی میں اہم
رول ادا کیا ہو[2]

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عہد
بنو عباسیہ (۱۳۲ھ/۷۵۰ء تا ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء)
میں اہل جندیشاپور کا اثر و رسوخ خلیفہ
ابوجعفر منصور کے زمانے میں خاص طور سے
بڑھا جسکی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۴۸ھ میں منصور
کو معدے کی شکایت پیدا ہوئی اور اطبار
کے علاج کے باوجود اسمیں روز بروز
اضافہ ہوتا چلا گیا بالآخر اس نے تمام
اطبار کو جمع کرکے کہا کہ میں تمام شہروں
کے اطبار میں سے ایک ماہر طبیب کو بلانا
چاہتا ہوں۔ سب نے بالاتفاق جورجیس کا
نام لیا جو اس وقت جندی شاپور کا رئیس
الاطباء اور وہاں کے شفاخانے کا مہتمم تھا
منصور نے اسکو طلب کیا اور وہ شفاخانے
کو اپنے لڑکے بختیشوع کے سپرد کرکے
بغداد میں اپنے شاگردوں یعنی ابراہیم اور
عیسیٰ بن سہلا کے ساتھ آیا اور ۱۵۲ھ
تک منصور کا طبیب خاص رہا اسکے بعد
بیمار ہوکر اپنے وطن جندی شاپور چلا گیا
اور اپنے عوض منصور کے علاج کے لئے
اپنے شاگرد عیسیٰ بن سہلا کو
چھوڑ گیا[3]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف بایو ایتھکس ص ۸۸۲ [2] اے میڈیکل ہسٹری آف پرشیا ص ۶۸
[3] اخبار الحکماء، قفطی ص ۱۰۹ - ۱۱۰؛ ۱۱۱

پھر جب اس مرض سے نجات پائی تو
منصور نے اسکو دوبارہ طلب کیا لیکن اسنے
اپنی کمزوری کی وجہ سے معذرت کی اور اپنے
ایک دوسرے شاگرد عیسیٰ بن چہار بخت کو بھیجنا
چاہا لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا اسلئے اسنے
ابراہیم کو روانہ کیا اور عیسیٰ بدستور جندی
شاپور کے شفاخانے میں کام کرتا رہا[1]

اسکے بعد خلیفہ مہدی کے زمانے
میں اسکا بیٹا ہادی بیمار ہوا تو اس نے علاج
کے لئے جندیشاپور سے جورجیس کے بیٹے
بختیشوع کو طلب کیا لیکن ہادی کی ماں
خیزران کا طبیب خاص ابوقریش تھا جسلئے
خیزران کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی کہ ابوقریش
کو چھوڑ کر بختیشوع کو علاج کے لئے طلب
کیا جائے چنانچہ وہ اور ابوقریش دونوں
بختیشوع کے درپے ہوگئے اور جب مہدی
کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے احترام کے
ساتھ بختیشوع کو جندیشاپور واپس کردیا

اسی طرح ہر خلیفہ کے پاس مخصوص
جندیشاپوری اطبار رہنے لگے اور وہ اپنی خدمات
انجام دیتے رہے لیکن ان خلفاء کی جانب
سے وہ توجہ نہیں ہوئی جو دراصل اس
مدرسہ کی فلاح و بہبود کے لئے ہونا چاہیے
اور وہیں کے ذمہ داران اپنی مدد آپ کوشش
کرتے رہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جندیشاپور کے
مدرسہ کی اہمیت اور طب کی ترقی کے
پیش نظر جب ہارون رشید نے بغداد
میں دارالشفاء قائم کرنے کا ارادہ کیا تو اس
نے جندیشاپور کے طبیب خاص بختیشوع
کے سپرد یہ کام کیا۔ قفطی نے اسکا ذکر
یوں کیا ہے۔ بختیشوع کہتا ہے۔

ہارون رشید نے مجھے دارالشفاء
بنوانے کا حکم دیا تو میں جندی شاپور گیا
اور وہاں کے دارالشفاء کے انچارج [illegible]
کو اسکے لئے پیش کیا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
بھیجا جندیشاپور کے شفاخانے میں کام
کرتے ہیں جو عوام الناس کی خدمت
اور رضائے الٰہی کے لئے کافی ہے[3]

---

[1] اخبار الحکماء، قفطی ص ۱۵۵
[2] ایضاً ص ۱۰۱ [3] ایضاً ۳۸۴

پھر بختیشوع کہتا ہے کہ میرے پاس طبیبا
تیوس جو تکلیف آیا۔ اور اس نے ان
دونوں کے لئے معافی چاہی جس میں نے
معاف کروایا اس کے بعد اس نے بختیشوع
سے کہا کہ اگر آپ نے معاف کر دیا تو
میں آپ کے سامنے ایسا تحفہ پیش کرتا
ہوں۔ جس سے اس بیمارستان کو
فائدہ پہونچے گا اس نے ہدیۃً ایک
لڑکے کو پیش کیا جو طب سے کافی واقفیت
رکھتا تھا۔"

اس بیمارستان میں یوحنا بن ماسویہ
نے بھی افسر الاطباء کی حیثیت سے کام کیا ہے
چونکہ ان دونوں کا تعلق جندیشاپور سے
تھا اسلئے اس سے جندیشاپور کے اثر کا
اندازہ ہوتا ہے اور طب یونانی کے تسلط
کا پتہ چلتا ہے۔

آخری شخص جس کا نام تاریخ میں جند
یشاپور کے دار الشفا کے انچارج کی حیثیت سے
آتا ہے وہ شاپور بن سہل متوفی ۲۵۵ھ
ہے۔

اوپر کی باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے
کہ جس روز سے علم اسلام نے طب
کے اوپر توجہ دینی شروع کی اس دن
سے تقریباً ڈھائی سو سال تک جندیشاپور کے
اطباء کی رہنمائی میں کام ہوتا رہا اور طب
کی ترقی اور فروغ میں جندیشاپور کے
اطباء کا ایک اہم حصہ تھا۔

اس زمانے میں بھی اسلامی دنیا
میں جندیشاپور کا کیا مقام تھا؟ اس
سلسلے میں ہم اس دور کی عظیم المرتبت
شخصیات کی زبانی دو واقعات پیش
کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) ایک واقعہ تو وہ ہے جس کا ذکر
قفطی نے اپنی کتاب تاریخ الحکماء میں حنین
بن اسحٰق کے حالات کے تذکرہ کے تحت
کیا وہ لکھتا ہے۔

حنین کا والد اسحٰق مملکت حیرہ کے
ایک شہر عبادان کا باشندہ تھا جب
حنین جوان ہوا۔ تو حصول علم کے لئے
بغداد میں یوحنا بن ماسویہ کے یہاں پہونچا
حنین کی عادت تھی کہ دوران درس بہت
سوال پوچھتا تھا اور یوحنا کو اس چیز سے
نفرت تھی۔ ایک دن کسی سوال پر یوحنا
بھڑک اٹھا اور کہا حیرہ والوں کو طب
سے کیا تعلق؟ جاؤ اور بازار میں کوڑیاں بیچا
کرو حنین دل شکستہ ہو کر چلا گیا اور [illegible]

قائم رہا۔"

اس کو نقل کرنے کے بعد قفطی نے
لکھا ہے کہ جندیشاپور کے اطباء در اصل
اپنی اولاد و احباب کے علاوہ کسی اور شخص
کو طب کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور غالباً حنین
کو اسی وجہ سے نکال دیا تھا۔[1]

(۲)۔ دوسرا واقعہ جاحظ نے کتاب البخلاء
میں اپنے مخصوص تمسخر آمیز انداز میں لکھا
ہے وہ یوں رقمطراز ہے۔

"اسد بن جانی ایک طبیب تھا جب
اس کا ایک مرتبہ کاروبار ٹھنڈا ہو گیا تو ایک
شخص نے اس سے سوال کیا اس سال بہت
سے وبائی امراض پھیلے ہوئے ہیں اور تم صاحب
علم آدمی ہو صبر اور تحمل کی قوت رکھتے ہو
تمہارے پاس زبان ہے لوگوں کے
حالات سے باخبر ہو۔ خدمت خلق کا جذبہ
بھی تمہارے اندر موجود ہے پھر اسکے باوجود
تمہارا بازار کیوں سرد پڑ گیا تو اس نے
جواب میں کہا اول تو اسلئے کہ میں مسلمان
ہوں اور میرے طبیب ہونے سے پہلے میری
پیدائش کے پہلے سے لوگوں کا یہ عقیدہ ہے
کہ مسلمان کبھی کامیاب طبیب نہیں
ہو سکتا۔ دوسرے اسلئے کہ میرا نام اسد
ہے جبکہ میرا نام صلیب یا یوحنا ہونا چاہئے
میری کنیت ابو الحارث ہے جب کہ ابو عیسیٰ
یا ابو زکریا یا ابو ابراہیم ہونی چاہئے میں سفید
کتان کا لباس پہنتا ہوں جب کہ سیاہ ریشم
کی قبا پہننا چاہئے جبکہ مجھے نیشاپور کی زبان
استعمال کرنا چاہئے۔"[2]

یہ تمام اوصاف جنکا ذکر جاحظ نے
کیا ہے یہ سب جندیشاپور کے اطباء کے
اندر پائے جاتے تھے جن میں بیشتر اس وقت
سریانی عیسائی تھے جاحظ کے کہنے کا
مطلب یہ ہے کہ ابتدا میں کسی طبیب کی
مقبولیت بقدر اس وقت ہوتی تھی جب وہ
عیسائی ہو، جندیشاپور کی درسگاہ کا تعلیم
یافتہ ہو۔

مذکورہ بالا واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے
کہ جندیشاپور اپنے دور کا عظیم ترین مرکز
تھا اور وہاں کے اطباء بہت زیادہ اہمیت

بقیہ صفحہ ۴۴ پر

۱۔ قفطی ص ۱۷۵

۲۔ کتاب البخلاء ص ۱۰۱

ابوالمجاہد زاہد

غزل

اصل میں ہے وہی نماز۔ نماز
زندگی پر جو ہو اثر انداز

روحِ اخلاص سے جو خالی ہو
وہ عبادت ہے، سازِ بے آواز

ہے ترے نام سے مری پہچان
تجھ پہ لاکھوں درود، میرِ حجاز!

شاہ کونین اور نانِ جویں
یہ بھی ہے زندگی کا اک انداز

سمتِ پرواز بھی درست رہے
وقتِ پرواز اے مرے شہباز

عالمِ بے کراں کا اے زاہد
ذرہ ذرہ ہے عالمِ صد راز

اسلم نصیر پوری

غزل

ہو گئے آج وہ بدگماں دوستو
کل جو تھے دل میں مرے نہاں دوستو

زندگی نے جو ڈھایا ستم پہ ستم
موت بھی ہو گئی مہرباں دوستو

چشمِ تر سے لہو بن کے ڈھلتی رہی
آہ دل بے زباں بے فغاں دوستو

راہ بر پہ نہ اتنا بھروسہ کرو
لوٹ لے گا وہی کارواں دوستو

منزلوں کے نشاں راہ میں کھو گئے
آ گئے ہم کہاں سے کہاں دوستو

دل جلا ہے کہ دیر و حرم جل گئے
چار سو اٹھ رہا ہے دھواں دوستو

جانے کس سوچ میں گم ہے خاموش ہے
سر جھکائے ہوئے آسماں دوستو

کچھ تو صحنِ چمن میں اجالا رہے
پھونک دو بڑھ کے خود آشیاں دوستو

کہکشاں کو قدم بوس اسلم کرو
لامکاں کو بناؤ مکاں دوستو

یوپی کی قدیم مساجد کو مندر بنانے کی سازش

راشٹریہ سیوک سنگھ کا اشتعال انگیز منصوبہ

نئی دہلی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کی مسلمان دشمنی ہی اس کے وجود، مقبولیت اور اکثریتی فرقہ میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی بنیادی وجہ ہے۔ اس تنظیم کی جانب سے مسلمانوں کو "ہندیانے" انہیں قومی دھارے میں شامل کرنے اور اسلامی قوانین کی تنسیخ کے ذریعے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی ضرورت اور مطالبات وقتاً فوقتاً پیش ہوتے ہیں اور آر ایس ایس کو تمام مساجد کی بنیادوں میں قدیم منادر ہی نظر آتے ہیں، آر ایس ایس کے ترجمان انگریزی جریدہ "آرگنائزر" نے چند ماہ پہلے ایسی مساجد کی ایک فہرست شائع کی ہے جو اس کے دعویٰ وا تحقیق کی روشنی میں کبھی منادر تھے اس زہر افشانی اور شرارت کے انسداد و تدارک پر مرکزی حکومت کوئی توجہ آخر کیوں نہیں کرتی۔ ؟

مقام	مسجد کا نام	آر ایس ایس کا دعویٰ
(۱) جون پور	اٹالا مسجد	یہ اصل میں اٹالا دیوی کا مندر تھا جسے بیجے چند نے بنایا تھا اور جسے سلطان ابراہیم ([illegible]) نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۲۔ جونپور	جامع مسجد	تبلا دیوی کا مندر جسے فیروز تغلق نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۳۔ جون پور	جھنجھاری مسجد	غیر معروف مندر جسے شاید چندر نے بنایا اور سلطان ابراہیم شرقی نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۴۔ جون پور	لال دروازہ مسجد	وشیشور مندر جسے [illegible]ء میں گوند چندر نے بنایا اور جسے سلطان محمود شرقی کی ملکہ بی بی راجی نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔

۵۔ جون پور	خالص مخالی کی مسجد	غیر معروف مندر جسے وجے چندر نے بنایا تھا اور جسے ابراہیم شرقی کے ایک درباری نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۶۔ وارانسی	جعفر آباد کی مسجد	کاراکوٹ کا غیر معروف مندر جسے جعفر خاں نے ۱۳۷۹ء میں مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۷۔ وارانسی	ابراہیم بار بک کی مسجد	کاراکوٹ کے قلعہ کا مندر جسے وارانسی کے جعفر آباد قلعے کے اندر والی مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔
۸۔ وارانسی	بندو مادھو مسجد	بندو مادھو کا مندر جسے ۱۶۶۹ء میں تبدیل کیا گیا
۹۔ وارانسی	گیان باپی مسجد	گیان واپی مندر جسے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔
۱۰۔ وارانسی	پنج گنگا گھاٹ مسجد	کرتی وشویشور مندر جسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا
۱۱۔ وارانسی	ہشت پہلو مینار	موگا گندھا کوٹی کا بودھ مندر، اشوک کا استوپا اور سراتھا جنہیں شہنشاہ ہمایوں کے دورہ کی خوشی میں اکبر نے ہشت پہلو مینار میں تبدیل کر دیا۔
۱۲۔ وارانسی	مسجد	وشوناتھ و شاشوند میدھا گھاٹ کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۱۳۔ متھرا شہر	جامع مسجد	عبدالنبی نے ۱۶۶۱ء میں یہاں کے مندروں کو تباہ و برباد کر دیا۔
۱۴۔ متھرا	شیخ فرید کا مزار	غیر معروف جین مندر جسے شیخ فرید کے مزار میں تبدیل کر دیا گیا۔
۱۵۔ متھرا	مسجد	ڈیرہ کیسورائے مندر کو اورنگ زیب عالمگیر نے ۱۶۷۰ء میں مسجد میں تبدیل کر دیا۔

۱۶۔ اجودھیا	مسجد	شری رام چندر جی کے جنم استھان والے مندر کو شہنشاہ بابر نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔
۱۷۔ سنبھل مراد آباد		ہری ہرمندر ... کو مسجد میں کر دیا گیا۔
۱۸۔ للت پور	درگاہ	چندیل مندر جسے درگاہ میں تبدیل کر دیا گیا
۱۹۔ جالور	لا معلوم	غیر معروف مندر، جسے مسجد یعنی دفتر بنا دیا گیا
۲۰۔ بدایوں شہر	مسجد	غیر معروف مندر جسے رکن الدین فیروز ۱۲۲۳ء کی گورنری کے زمانہ میں تبدیل کر دیا گیا۔
۲۱۔ بدایوں	عید گاہ	غیر معروف مندر جس میں برہما مہادیو وغیرہ کی شبیہ موجود ہے اسے حوض شمس اور عید گاہ میں تبدیل کر دیا گیا
۲۲۔ مہوبا ہمیر پور	درگاہ	مشہور مندر جسے کرتی ورما نے بنایا اور علاؤ الدین خلجی نے درگاہ میں تبدیل کر دیا۔
۲۳۔ بندرابن	لا معلوم	گووند دیو مندر جسے راجا مان سنگھ نے بنایا تھا اسے اکبر کے دور حکومت میں مسجد میں تبدیل کیا گیا۔
۲۴۔ بڑا دوار بجنور	مسجد	اس کو بھی مندر سے مسجد میں تبدیل کیا گیا۔
۲۵۔ جالور	امارت توپ کھنڈ مسجد	
۲۶۔ وارانسی		کمھار بیر کا مندر مسجد میں تبدیل کر دیا۔

بقیہ جندیشاپور کا قدیم مدرسہ

کے حامل تھے طب اسلامی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اس ادارہ کا بہت زیادہ ہاتھ رہا ہے یہ چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک علم کا عظیم مرکز رہا ہے انہیں علم و فنون خصوصاً طب کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ ایشیا کے کوچک کے کسی ادارہ کو نہیں ہوا۔

بہرحال اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عقلی اور طبی علوم پر جس حیثیت سے نگاہ ڈالی جائے گی جندیشاپور کے گہرے اثرات ضرور ملیں گے

عبدالجلیل، زمین رسولپور، اعظم گڑھ، یوپی

ایڈیٹر کے نام ایک خط

مراسلہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

محترم مدیر حیات نو　　　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مارچ ۱۹۸۶ء کے حیات نو میں محترم جناب عبدالمغنی صاحب (پٹنہ) نے ووٹ سے متعلق اختلافی مسئلہ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے حالات کا صحیح تجزیہ کرنے سے پہلوتہی کی ہے۔ ہر ملک میں کام کرنے کے حالات الگ ہوتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے حالات کو یکساں تصور کرنا صحیح نہیں ہے۔ پاکستان میں جماعت اسلامی نے ملکی دستور میں دینی نظام کے بنیادی اصول منوانے کے بعد ہی الیکشنی سیاست میں حصہ لیا وہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت کی بنا پر دستور سے وہ شرعی موانع ملک گیر تحریک کے ذریعہ جلد ہی دور کرا لئے گئے جو پارلیمانی سیاست میں حصہ لینے کی راہ میں حائل تھے لیکن جماعت کی مقبولیت کے باوجود پیپلز پارٹی نے انتخابات میں جو اکثریت حاصل کی تھی وہ کسی سے پوشیدہ تو ہے نہیں۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل وکرم تھا کہ بھٹو کا دور حکومت بدترین انجام پر ختم ہوا اور جنرل ضیاء الحق صاحب نظام اسلام کے قیام کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہ انقلاب ووٹ کی پرچیوں سے تو ممکن نہ تھا۔

اس کے برعکس ہندوستان میں الیکشن میں حصہ لینے کے لئے دستور میں جو شرعی موانع موجود ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اگر فاضل مکتوب نگار کے نزدیک نظریاتی اور ملی مسئلوں کے درمیان تمیز وتفریق مناسب نہیں ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ موصوف کو "ملت کے مسائل" کا اب احساس ہوا ہے حالانکہ تشکیل جماعت کے وقت (۱۹۴۱ء میں جبکہ ملک تقسیم نہیں ہوا تھا) اور ۱۹۴۷ء میں جبکہ ملک تقسیم ہو گیا) "ملی مسائل" آج سے شدید تر اور سنگین حالات میں موجود تھے لیکن افراد جماعت کے نزدیک یہ بات صاف تھی کہ "ملی مفادات" کے لئے نہیں بلکہ مکمل اسلامی نظام کی فکری اور عملی راہ ہموار کرنے کے لئے جماعت

اسلامی کا قیام عمل میں آیا اب رہ گئے ملی مسائل اور مسلم تحفظات کے لئے مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء سرگرم عمل تھیں اور جماعت اسلامی کی تشکیل کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ آج بھی مسلم لیگ مجلس اتحاد المسلمین اور مسلم مجلس وغیرہ سیاسی پارٹیاں ملت کے مسائل نیز دیگر پسماندہ طبقات کے مفادات کے تحفظ ہی کے لئے تو جد وجہد کر رہی ہیں۔ پھر جماعت اسلامی کو سیاسی میدان میں آکر ایک ایسا تجربہ دہرانے کی کیا ضرورت تھی جس کو مجلس مشاورت نے ۱۹۶۷ء میں استعمال کر کے ناکامی کا منہ دیکھا تھا۔ جماعت نے اپنے اندر کے "فعال عناصر" کے تقاضے پر حیدرآباد میں ایک اچھا نمونہ پیش کیا کہ ایک حلقۂ انتخاب میں مجلس اتحاد المسلمین کے امیدوار کی حمایت کی اور دوسرے حلقۂ انتخاب میں مجلس کے امیدوار کی مخالفت کرتے ہوئے تلگو دیشم کی حمایت کی۔ اس طرح "فعال عناصر" کے تقاضے نے اس ملت کے اندر بھی افتراق کا بیج بو دیا جس کے مسائل سے ہم صرف نظر نہیں کر سکتے۔ پھر ذرا آگے دیکھئے کہ یکساں سول کوڈ کے سلسلہ میں نیشنل کانفرنس مسلم لیگ اور اکالی دل کے علاوہ پارلیمنٹ میں بھی سیاسی پارٹیاں ایک ہی منشور میں راگ الاپ رہی ہیں۔ ۲۰ر فروری ۱۹۸۶ء کو جب وزیر اعظم نے مطلقہ کے نان ونفقہ سے متعلق بل پیش کرنا چاہا تو مذکورہ بالا پارٹیوں کے علاوہ کچھ پارٹیاں پارلیمنٹ ہاؤس سے واک آؤٹ کر گئیں اور جب بل پیش ہوا تو نیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، اکالی دل نیز چند مسلم ممبروں کے علاوہ حزب مخالف کے ممبر شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ اب تو "فعال عناصر" کو بھی "حقیقت پسندی" کے مظاہرے سے دست کش ہو جانا چاہئے۔

موصوف نے ایک جملہ "ملت دوستی کا مطلب فرقہ پرستی ہرگز نہیں ہونا چاہئے" تحریر فرماکر "جماعت کے غیر فعال عناصر" کو ٹھیک اسی پیرایہ میں طنز وتعریض کا نشانہ بنایا ہے جس میں اشتراکیت زدہ یا اسلام سے متنفر افراد اور ماڈرنائزڈ اور اباحیت پسند مسلم دانشور کرتے ہیں۔ اگر اسلام سے محبت، اسلامی عقائد وشعائر کو اختیار کرنا، اسلامی احکامات پر عمل کرنا اور قرآن وسنت کی روشنی میں مکمل اسلام کی دعوت دینا فرقہ پرستی ہے تو بلا شبہ ہم فرقہ پرست ہیں اور ہم اسی فرقہ پرستی کے لیبل کے ساتھ انشاء اللہ پارلیمنٹری پالیٹکس میں آئیں گے لیکن ابھی وقت دور کا ہے۔ ہم موجودہ سیاست میں پیوندکاری کے ذریعہ داخل ہو کر اپنی تاثیر

(بقیہ صفحہ ۵۰ پر)

حلقۂ یاراں

برادر مکرم طارق صاحب

سلام مسنون

خدا کرے آپ بخیر ہوں ماہ فروری کا شمارہ دیکھا۔ اس بار نور محمد فلاحی صاحب سے طبیعت خوش ہو گئی اس طرح اگر تفصیل سے جامعہ کی خبریں دیتے رہیں تو ہم فلاحیوں کو ذہنی تسلی رہے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ افلاح میگزین کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ اگر اس میں اس کی ادارت وغیرہ کی تفصیلات بھی شائع کر دی جائیں تو بہتر ہوگا۔

ڈاکٹر قاضی اشفاق صاحب کا انٹرویو بڑا جاندار ہے۔ بڑی معلوماتی چیزیں آگئی ہیں۔ ہندوستان میں تحریک کے طریقۂ کار پر بھی گفتگو کی ہے لیکن میرے خیال میں دعوتی و ملی تقسیمیں صحیح نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ مدتوں سے سر اٹھا رہا ہے کہ ملی مسائل کے سلسلہ میں جماعت کا موقف کیا ہو۔ ملی مسائل میں دلچسپی لینے سے اصولی حیثیت ختم ہو جاتی ہے یا نہیں؟ ایک چیز بالکل واضح رہنی چاہیے کہ جو لوگ پہلے سے مسلمان ہیں وہ ہماری اصلاحی مساعی کے زیادہ محتاج ہیں اور ان کے ذریعہ اقامت دین کی جدوجہد زیادہ آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہے بشرطیکہ تربیت و اصلاح کا موثر طریقہ استعمال کیا جائے۔ اور یہ کام ان کے مسائل میں دلچسپی لئے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے ملی مسائل کو حل کرنے کی براہ راست کوشش اقامت دین کی کوششوں کا ایک اہم زینہ بن سکتی ہے اور اس کے ذریعہ امت مسلمہ کو قیام پر آمادہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں میں کام چھوڑ دیا جائے یا ان سب کو دشمن سمجھ لیا جائے۔

مثال کے طور پر شاہ بانو کیس کو لیجئے یا بابری مسجد کے حادثہ کو لیجئے۔ ان واقعات کو ملی مسئلہ کہہ کر ثانوی حیثیت دینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ یہ امت کے اولین مسائل ہیں بلکہ تحریک اسلامی کے بھی۔ ان میں براہ راست دلچسپی لیکر پوری شریعت کی اشاعت و تحفظ کی جو مہم چلائی جا رہی ہے وہ خاصی کامیاب ہے۔ بابری مسجد کو مندر میں تبدیل

بقیہ صفحہ [illegible] پر

از ڈاکٹر صلاح الدین [illegible]
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تعارف و تبصرہ

وہ کتاب جس پر یہ تبصرہ مطلوب تھا تاخیر ہو گئی

تاریخ دعوت و جہاد ... برصغیر کے تناظر میں

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک مخصوص طرز کی منفرد زندگی گذارنے کا سبق دیتا ہے، اس زندگی کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ انسان اپنے مقصد تخلیق کو ہمیشہ پیش نظر رکھے وہ زندگی دنیا پرستی کی اجازت دیتا ہے اور ترک دنیا کی بلکہ اس کا اپنا ایک معتدل نظام حیات ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کی ساری کی ساری زندگی اسلام کے سایہ میں گذرے دنیاوی زندگی کے تقاضوں پر وہ پابندی نہیں لگاتا بلکہ ان کو برتنے کے مخصوص طریقوں سے ان کی حد بندی کرتا ہے، اس کے یہاں مادیت اور روحانیت کا ایک حسین امتزاج ہے جس میں دنیا کی بھول چوک سے توازن بگڑتا ہے اور یہ اسلام توازن انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے، چنانچہ اس کا اپنا نظام عبادت ہے، نظام معاشرت ہے، نظام معیشت ہے اور نظام سیاست ہے، غرضیکہ زندگی کے ہر گوشہ پر اس کی تعلیمات محیط ہیں۔

عبید اللہ فہد نے برصغیر کی سیاسی، دعوتی، تحریکی، اور تہذیب و تمدن کی تاریخ کا مطالعہ اسی مخصوص نظام حیات کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ گویا کہ ان کے پاس پہلے ہی سے اسلام کا عطا کردہ ایک پیمانہ ہے جس پر انھوں نے برصغیر کی پوری تاریخ کو ناپا تولا ہے۔ انھوں نے نہ صرف سیاسی اور تہذیبی تاریخ کو کھنگالا ہے بلکہ مختلف ادوار میں ابھرنے والی اصلاحی اور دعوتی تحریکوں اور مصلحین کی شخصیات کی نشو نما اور انکی تحریکی و اصلاحی سرگرمیوں کی تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے ان کی کامیابی و ناکامی کے اسباب پر بھی قدرے روشنی ڈالی ہے اس سلسلہ میں مصنف نے حتی الوسع تنگ نظری اور غیر ضروری فراخدلی دونوں کیفیتوں

گزر گیا ہے جس سے وہ چاہ کر عام طور سے مورخین لغزش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مصنف نے کہیں کہیں بے انتہا اختصار سے کام لیا ہے مثلاً تحریک اہل حدیث کے ضمن میں مصنف نے لکھا ہے کہ "۱۹۰۶ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے نام سے باضابطہ اس کی تشکیل بھی ہو گئی اور اس کے ملک کے مختلف مقامات پر باقاعدہ جلسے بھی ہونے لگے" لیکن اس پورے تذکرہ میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں کہ اس تحریک کا بانی کون تھا، آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام کس جگہ اور کن لوگوں کے ذریعہ عمل میں آیا۔ مجموعی طور سے یہ باب انتہائی تشنہ ہے اور مزید ضروری تفصیلات کا متقاضی ہے۔

کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے خوش فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تحریکی ذہن سے خواہ مخواہ کسی تحریک یا شخصیت کو اپنے معیار کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً ایک جگہ خاکسار تحریک پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "خاکسار تحریک مسلمانوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس تحریک کے ممبر یہودی، عیسائی، برہمو سماجی اور وہ تمام لوگ بن سکتے تھے جو خدا اور مذہب پر یقین رکھتے تھے...... بلا لحاظ مذہب وملت تمام فرقوں اور جماعتوں کے یہ خادم تھے۔ یہ اتحاد اور وحدت انسانیت کے داعی تھے"...... پھر ایک اور جگہ اس تحریک کے بانی کے سلسلہ میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامہ موصوف نے قوم کے نونہالوں کی تربیت اور اپنے سپاہیوں کی ٹریننگ اس انداز سے کی کہ اسلام میں غالب بن کر رہنے کا نام ہے، اسلام وایمان کی انتہا علیحدہ حکمرانی ہے" ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی چاہتی تھی، انھیں عزت وحشمت کے اس بام تک پہنچانا چاہتی تھی جس پر آج سے چودہ سو سال پہلے یہ قوم فائز تھی (بحوالہ ریڈینس ۲۴ر دسمبر ۱۹۷۳ء)

لیکن اس تحریک کے تین بنیادی اصول یعنی (۱) خدا پر مکمل ایمان خواہ وہ کسی بھی مذہب کا خدا ہو (۲) اپنے عقیدہ کے مطابق رسول کی اطاعت خواہ وہ کرشنا ہوں، موسیٰ ہوں، عیسیٰ ہوں، بدھا ہوں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور (۳) امیر کی غیر مشروط اطاعت وفرمانبرداری سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس تحریک کا مقصد غلبہ اسلام برپا کرنا تھا

اور نہ کہیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد مخصوص طور پر مسلمانوں میں بیداری اور دینی تحریک کا داعیہ ابھارنا تھا، جیسا کہ مصنف نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے بلکہ اس تحریک کے اصول وضوابط پر نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصد محض ملکی نوجوانوں کو مستعد کرنا اور ان سے سستی وکاہلی جیسی بیماریاں دور کرنے کا مقصد پیش نظر رکھا تھا۔

مجموعی طور پر کتاب جو نو ابواب پر مشتمل ہے، کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مقدمہ میں مصنف نے (۱) انقلاب اور تحریک (۲) تحریک اسلامی کا تصور (۳) اور ہندوستان میں تحریک اصلاح وتجدید کے عنوانات کے تحت تحریک اسلامی اور اس کی بنیادی مقاصد، افادیت اور خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ باب اول ہندوستان میں دعوت دین کے آغاز پر روشنی ڈالتا ہے، دوسرے باب میں تحریک اسلامی کے تئیں مسلم سلاطین ہند کے موقف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں صوفیائے کرام اور مشائخ اسلام کی تبلیغی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے یہاں کے سیاسی پس منظر میں الحاد واباحیت کے خلاف ان کی اصلاحی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔ چوتھے باب میں مصنف نے شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تجدیدی اور اصلاحی نشاۃ ثانیہ کو اجاگر کیا ہے جو بجا طور پر جدید اسلامی ہندوستان کے بانی کہے جا سکتے ہیں۔ پانچواں باب اسلامی تحریکات میں تحریک مجددیت، فرائضی تحریک اور تحریک مجاہدین جس میں سید احمد شہیدؒ کی دعوت جہاد اور اقامت دین کی کوششوں کے تفصیلی جائزہ پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں تحریک آزادی کے عنوان کے تحت تحریک ریشمی رومال، تحریک خلافت، تحریک خاکسار اور تحریک اہل حدیث وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحریک اہل حدیث کو تحریکات آزادی کے تحت ذکر نہ کر کے اگر پانچویں باب یعنی تحریکات اسلامی میں جگہ دی جاتی تو غالباً زیادہ مناسب تھا۔ ساتویں باب میں تعلیمی تحریکات کے ضمن میں علی گڑھ، دیوبند اور ندوہ اسکولوں کی تعلیمی اصلاحی کوششوں سے بحث کی گئی ہے۔ ندوہ اسکول کے تحت ہی مصنف نے جامعۃ الفلاح اور مدرسۃ الاصلاح کا تذکرہ بھی کر دیا ہے جو کسی حد تک نامناسب لگتا ہے کیونکہ جامعۃ الفلاح کا بذات خود اپنا ایک پس منظر ہے اور اس کی اپنی ایک مستقل

تعلیمی فکر ہے جو کئی پہلوؤں میں ندوہ اسکول سے حاصل ہونے کے باوجود بنیادی طور پر مختلف تعلیمی فکر رکھتا ہے۔ آٹھویں باب میں بیسویں صدی کی چند اہم شخصیات میں شبلی، حالی، اکبر الہ آبادی، فراہی، ابوالکلام آزاد اور شبیر احمد عثمانی کی حیات اور کارناموں کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا گیا ہے۔ نواں باب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں تحریک تبلیغ اور مولانا الیاسؒ کی دعوتی اور اصلاحی جد و جہد پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں ڈاکٹر اقبال کی احیائے دین کی کوششوں اور ان کے نقطہ نظر پر مفصل بحث ہے اور تیسرے حصہ میں مولانا مودودیؒ اور جماعت اسلامی کی اقامت دین کی کوششوں اور اس کے تئیں جماعت کے موقف کو وضاحت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر اقبال کو بجا طور پر باب کے ایک مفصل حصہ میں ان کی تجدیدی کوششوں پر بحث کر کے جائز مقام دیا ہے۔

بہر حال ۳۹۱ صفحات پر مشتمل ہندوستان پبلیکیشنز سے شائع ہونے والی یہ کتاب مجموعی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے جس میں ابتداء سے لے کر اب تک کی برصغیر کی دعوتی تاریخ کا اگرچہ اختصار سے لیکن ٹھوس بنیادوں پر مطالعہ کیا گیا ہے۔ ٹائٹل اور کتابت و طباعت بھی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ مصنف اور ناشر اس نیک اقدام کیلئے قابل مبارکباد ہیں۔

(بقیہ حلقہ یاراں)

جناب مدیر صاحب "حیات نو" السلام علیکم

حیات نو کیا ہے؟ سید حامد حسینؒ کی زندگی کا ایک مرقع ہے۔ براہ کرم رفیق دوستہ روڈ پٹنہ ۴، موسٹ دہلی ۱۵۱ سی ذاکر نگر دہلی ۲۵، محمد سجاد صاحب طارق منزل بریاتو ہزاری باغ، کاوٹی دار جی ۹، فن کار لکرا کوٹ، بھتہ بازار حیدرآباد ۲، افضل حسین صاحب قیم جماعت ۱۳۵۳ چتلی قبر دہلی ۶، کو اپنی جانب سے تحفہ بھیجئے۔

اشفاق احمد صدر S.I.O کو بھی ایک کاپی بھجوائیے تاکہ سماج سدھار کیمپ کی پیروی S.I.O اور S.I.O والے عمل میں لائیں اور تحریک میں جان پیدا کریں۔ نوجوانوں کا مسئلہ ختم ہو گیا۔ اب تو نوجوانوں کی اسلامی تنظیموں کے استحکام کے لئے منظوط کارہ علمی مذاکرہ حیات نو میں منصوبہ سازوں سے گھر اہیں۔

خادم: محمد بندی

الم

جامعہ کے لیل و نہار

"قرآن، صبر اور نماز کا دامن نہ چھوڑنا" مولانا شبیر احمد اصلاحی

جامعۃ الفلاح کے تمام طلبہ سالانہ امتحان کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ اب صرف چند روز باقی رہ گئے ہیں۔ ۵ر اپریل ۱۹۹۶ء سے امتحانات شروع ہو جائیں گے اور ۲۰ کو ختم ہوں گے تمام طلبہ اسی دن اپنے اپنے گھروں کو جا سکیں گے، اساتذہ کرام ۲۶ر اپریل تک ٹھہرے رہیں گے اور نتائج کی تکمیل کے بعد ہی گھر جا سکیں گے۔

اعلیٰ درجات کے لئے جامعہ سے متصل قبرستان کے مشرق کی طرف ۶ کمروں اور ایک لکچر ہال پر مشتمل عمارت زیر تعمیر ہے انشاء اللہ جلد ہی تکمیل کو پہنچ جائے گی۔ مطبخ کے شمال میں اس سے بالکل متصل دس بارہ بیت الخلاء بنائے جا رہے ہیں جو چند ہفتوں میں مکمل ہو جائیں گے۔

۳ر مارچ ۱۹۹۶ء کو ۱۰ بجے فارغ ہونے والے طلبہ کو اسکول کی طرف سے پارٹی دی گئی جس میں تمام اساتذہ اور آخری درجے کے طلبہ شریک رہے۔ یہ الوداعی پارٹی کچھ زیادہ ہی الوداعی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ لڑکے اور اساتذہ دونوں ایک دوسرے کی جدائی کے غم میں نڈھال تھے۔ ناشتہ اور چائے کے بعد مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی صدر جامعہ نے طلبہ کو نصیحتیں کیں، محبت اور سوز میں ڈوبی ہوئی آواز دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئی۔ آپ نے فرمایا "علم ایک خزانہ ہے اگر کوئی بہت لمحہ تک اس کے حصول میں لگا رہے تب بھی ختم نہیں ہوتا۔ علم کی ہر منزل سے آگے ایک منزل ہوتی ہے جو طالب علم کو آواز دیتی رہتی ہے۔ آپ زیور علم سے آراستہ ہوئے ہم کو خوشی ہے مگر آپ جا رہے ہیں اس لئے ہم مغموم بھی ہیں۔ آپ جہاں بھی جائیں، دین کے داعی بن کر ابھریں اور اپنے علم و عمل پر قائم رہیں اور ہر جگہ فائز المرام اور کامیاب ہوں۔"

مولانا شبیر احمد اصلاحی صاحب نے ایک جملے میں اپنی بات پوری کر دی فرمایا میں تم سے

صرف ایک بات کہتا ہوں، جہاں بھی رہنا، قرآن، صبر اور نماز کا دامن نہ چھوڑنا۔"

مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب نے فرمایا "جس طرح باغباں اپنے لگائے ہوئے درختوں کے پھل سے خوش ہوتا ہے ویسے ہی آپ شجر جامعہ کے شیریں پھل ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی اور ہم کو سکون ملتا ہے۔ آپ کا اور ہمارا رشتہ باپ بیٹے کا رشتہ ہے۔ آپ کی جدائی ہمارے لئے تکلیف دہ ہے آپ جہاں بھی رہیں جو کچھ آپ نے سیکھا ہے اس کو باقی رکھیں مطالعہ کو آگے بڑھائیں اور اپنی زندگی کو نمونے کی زندگی بنائیں۔ اس علم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا جس کے پیچھے عمل نہ ہو۔"

پھر محمد حسن نیپالی نے تمام ساتھیوں کی طرف سے اساتذہ کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا "میرے شفیق اساتذہ کرام آپ نے ہماری تربیت کی اور ہم کو زیور علم سے آراستہ کیا اور اب ہمیں میدان عمل میں بھیج رہے ہیں۔ ہم آپ کی کوششوں کو تشکر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں خدا آپ تمام لوگوں کو اور ہم سب کو بہترین اجر سے نوازے۔"

اس سال فارغ ہونے والے طلبہ: (۱) محمد حسن نیپالی (۲) انور کمال (۳) نفیس احمد (۴) کمال الدین (۵) محمد فاروق (۶) سراج الدین (۷) مجاہد الاسلام (۸) ہارون احمد (۹) صغیر احمد (۱۰) حافظ اسرار احمد (۱۱) ابو رافع (۱۲) تنویر عالم (۱۳) انوار عالم (۱۴) عبدالباری (۱۵) انوار احمد اعظمی (۱۶) محمد امین کشمیری (۱۷) محمد خالد۔

انصار احمد فلاحی کو صدمہ سکریٹری انجمن کی اطلاع کے مطابق فلاحی برادران کے خطوط مسلسل چلے آرہے ہیں جنمیں انصار صاحب فلاحی اور ان کے برادران اور والدین سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا گیا ہے اور ان کے مرحوم چچا کیلئے رحمت اور مغفرت کی دعا نیز پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی تلقین کی گئی ہے۔ امان اللہ صاحب مرحوم انصار صاحب کے رشتے کے چچا اور بہنوئی بھی تھے، دل کے مرض میں مبتلا تھے آپریشن کی غرض سے بمبئی تشریف لے گئے تھے۔ بمبئی میں کئی دفعہ طبیعت سنبھلی اور پھر خراب ہوگئی۔ آپریشن کی تاریخ اور وقت متعین ہو جانے کے بعد لوگ آپریشن کی تیاریوں میں مصروف تھے اور مرحوم خدا سے ملاقات کے مشتاق۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ۸ جنوری ۸۰ء کو اپنے پاس بلا لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ حیات نو ان کے غم میں برابر کا شریک ہے خدا ان پر رحمت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

"ادارہ"